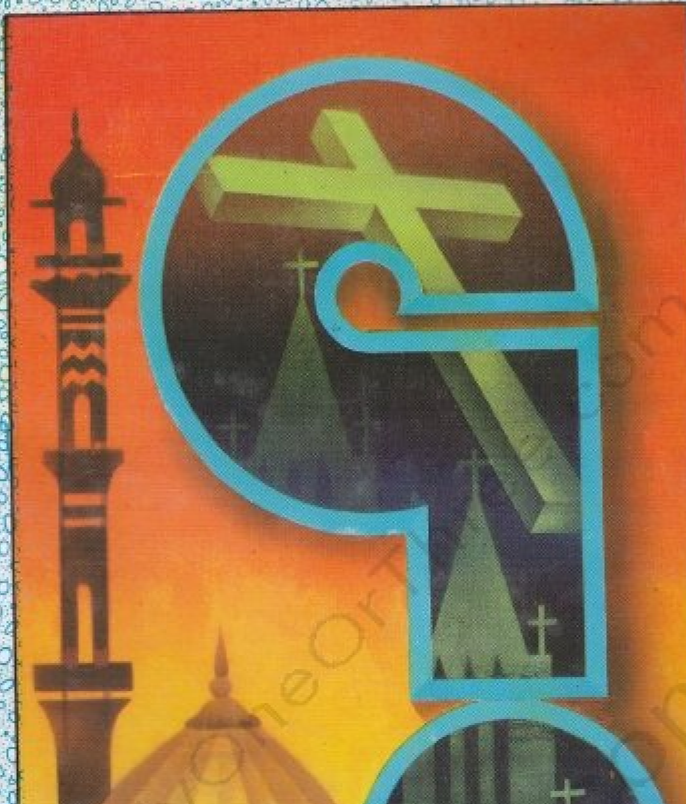


مسیح خدا نہیں

مصنف

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

الرد الجمیل لالٰہیۃ عیسیٰ بصریح الانجیل

مسیح خدا نہیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ابن اللہ ہونے کے عقیدہ کا
ناقابلِ تردید دلائل سے رد، انجیلِ مقدس کی عبارات کی وضاحت
حضرت عیسیٰ کی حیاتِ پاک پر ایک جامع اور تفصیلی تقدیم

مصنف
حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ و تقدیم
ظفر اقبال کلیار
(فاضل بھیرہ شریف)

زیر اہتمام

محمد رضاء الدین صدیقی

زاویہ

8-c دربار مارکیٹ لاہور

(042)7113553-(0303)6410692

نوٹ:- اس کتاب کے جملہ محاصل زاویہ فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) کے علمی و تحقیقی مصارف کیلئے وقف ہیں۔

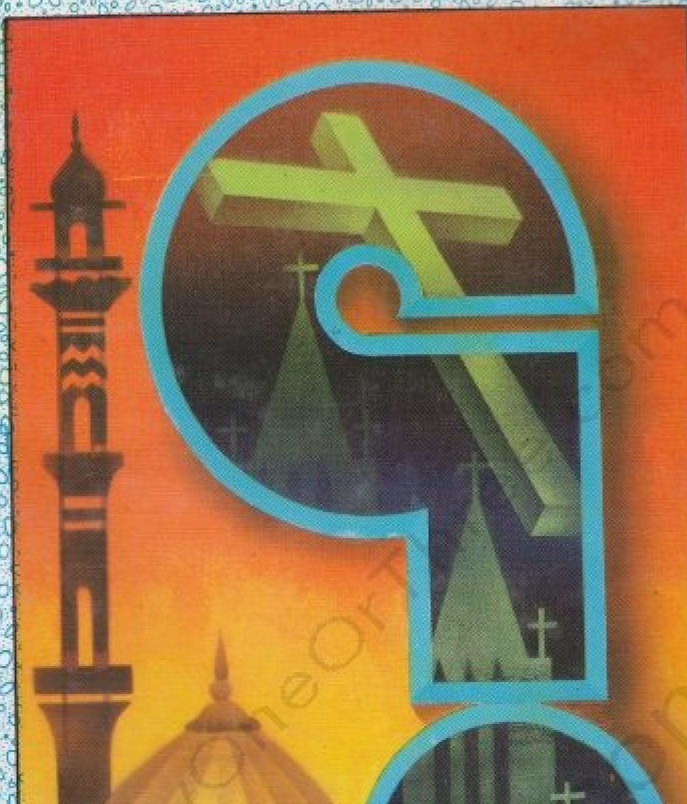
سال اشاعت	تعداد	ہدیہ
۲۰۰۳ء	500	100

مرکز ترسیل

مکتبہ زاویہ

(۱) 10 مرکز الاولیس (ستا ہوٹل) دربار مارکیٹ لاہور۔فون 042-7117152

(۲) خالد ایجوکیشنل سنٹر ۴۰ اردو بازار لاہور۔فون 042-7244157



مسیح خدا نہیں

مُصنّف

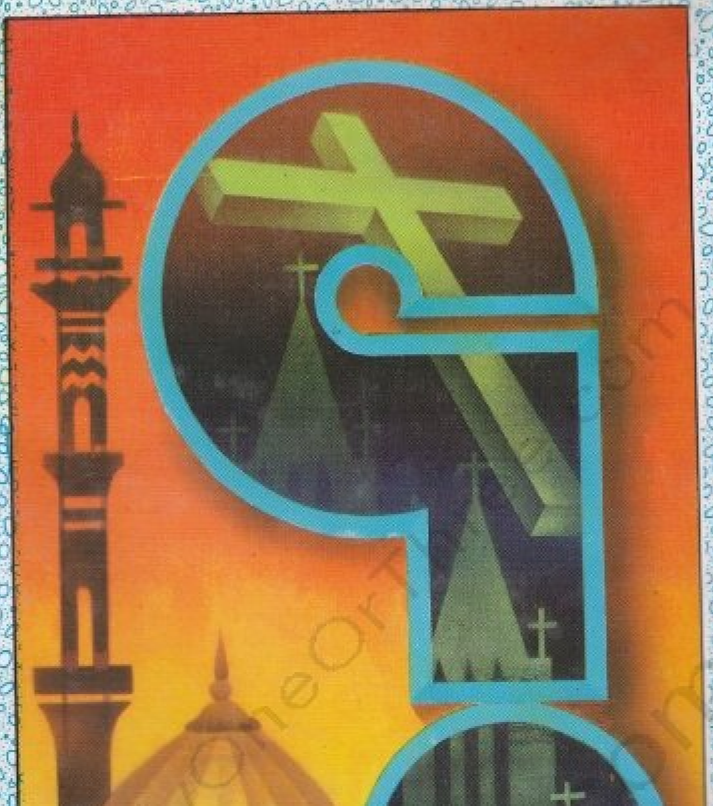
حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

انتساب

حضرت ضیاء الامت

جسٹس پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری

کے نام



مسیح خدا نہیں

مُصنّف

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

عکس

معجزات برھان رسالت ہیں

حضرت عیسی علیہ السلام کی نورانی تعلیمات

مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی

مسیح خدا نہیں

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاں انبیائے بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں وہاں عالم انسانیت کے سب سے بڑے محسن و معلم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبشر ہیں۔ قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہ السلام کا ذکر ان کی عظمت و شان کے مطابق بیان کیا ہے۔

لیکن قابل تعجب اور افسوس ناک امر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ہدایت ربانی کو اپنے اصل رنگ میں پورے نکھار کے ساتھ پہنچاتے رہے اور "ان اعبداللہ ربی وربکم" کی تلقین فرماتے رہے لیکن ان کے نام لیواؤں نے مختلف مصلحتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے عقائد باطلہ کا ایک جال ان کی شخصیت کی گرد اس طرح بن دیا ہے کہ مسیحیت بے شمار گروہوں میں منقسم ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ خود مغربی مفکرین حیران و ششدر ہیں کہ ان کی صحیح

شخصیت' ان کا زمانہ اور ان کی صحیح تعلیمات کا تعین کیسے کیا جائے۔ ایک مستشرق مسٹر E.R.Pike نے بجا طور پر اس کیفیت بے یقینی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"No personality in history has aroused such prolonged such violent' such widespread controversy as Tesus of Nazareth"

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے جہاں اپنے دور میں فلسفہ میں رواج پانے والے غلط افکار کا رد فرمایا اور "تہافۃ الفلاسفہ" کے نام سے عظیم شاہکار تصنیف پیش فرمائی وہاں ایک نہایت مدلل اور مبسوط کتاب بعنوان!

"الرد الجمیل لالھیۃ عیسی بصریح الانجیل"

تحریر فرمائی۔ اور متکلمانہ انداز میں مسیحیت کے مروج عقائد باطلہ کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا۔

کتاب کی افادیت کے پیش نظر "زاویہ" اس کا اردو ترجمہ پیش کرنے کی سعادت کا حاصل کر رہا ہے۔ اردو ترجمے کا یہ فریضہ محمد ظفر اقبال کلیار صاحب (فاضل بھیرہ شریف) نے انجام دیا ہے۔ محترم کلیار صاحب نے مضمون کی اہمیت کے اعتبار سے ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ جس میں اناجیل کے باہمی تضاد' کفارہ اور تثلیث کے عقیدے کا تاریخی پس منظر' مختلف اوقات میں منعقد ہونے والی مسیحی کونسلوں کا ذکر اور مروج گمراہ کن مسیحی عقائد میں پولس کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔

راقم الحروف نے کلیار صاحب کے مقدمہ کا جستہ جستہ مطالعہ کیا ہے۔ موصوف نے بڑی عرق ریزی اور محنت و کاوش سے مضمون کو صراحت کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل عمیم سے ان کی اس علمی کاوش کو شرف قبول عطا فرمائے۔ اور عامۃ المسلمین کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس کتاب سے اور تعارفی مقدمہ سے بھرپور استفادہ اور مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

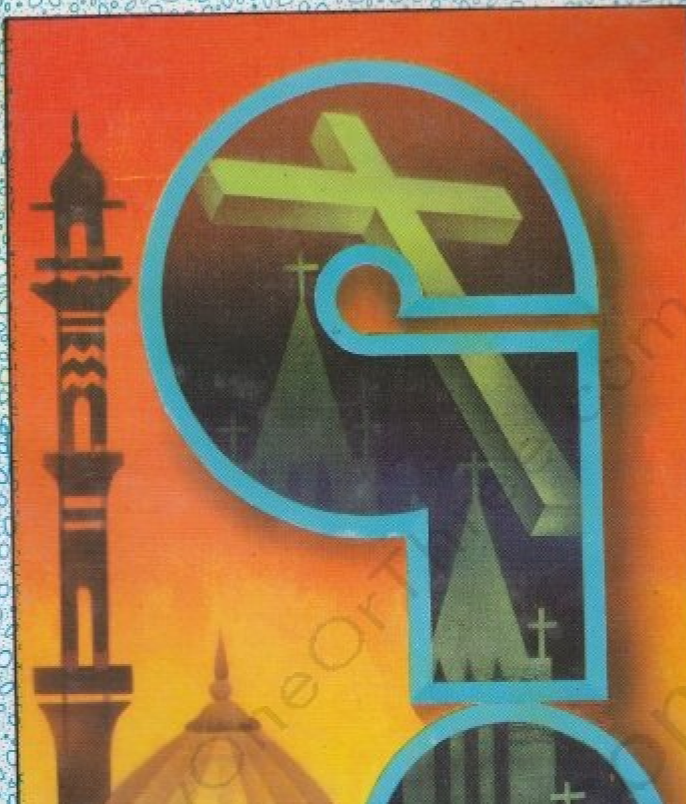
آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

احقر العباد

(پروفیسر ڈاکٹر) بشیر احمد صدیقی (عفی عنہ)

سابق صدر شعبہ اسلامیات جامع پنجاب لاہور

۲۰/ نومبر ۱۹۹۷ء



مسیح خدا نہیں

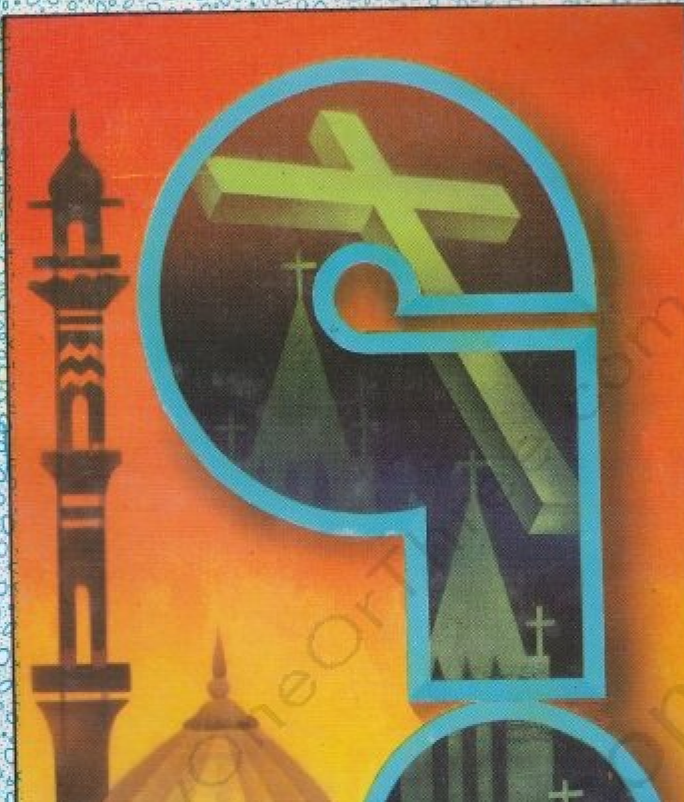
مُصنّف

حجۃُ الاسلام اِمام مُحمّد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

حیات حضرت عیسیٰ

(علیہ السلام)

(از ـــــ مترجم)



مسیح خدا نہیں

مُصنّف

حجۃ الاسلام اِمام مُحمّد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

عیسائیوں کے نزدیک سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت کا قابل اعتماد ماخذ صرف بائبل مقدس ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ علیہ السلام کی سیرت طیبہ کے کئی پہلو بائبل مقدس میں مرقوم ہیں۔ لیکن یہ کہنا بہرحال درست نہیں۔ کہ یہ واحد قابل اعتماد ماخذ ہے۔ قرآن کریم نے سیرت مسیح کے کئی پہلوؤں کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ہم مسلمان اسے معتمد علیہ ماخذ یقین کرتے ہیں۔ اور یہ خوش عقیدگی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ کہ بائبل کے مطالعہ سے جو شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں۔ ان کا جواب صرف قرآن حکیم ہی دے سکتا ہے۔

سیرت مسیح کا ایک تیسرا قابل اعتماد ماخذ انجیل برنباس ہے اسے نظر انداز کرنا تعصب ہوگا۔ ذیل میں عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت طیبہ کے اہم پہلوؤں کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

اسم پاک

آپ علیہ السلام کا علم عیسیٰ ہے۔ یہ لفظ عبرانی زبان سے معرب ہے۔ عبرانی میں اس کا تلفظ یشوع یا یسوع ہے۔ یسوع کا معنی سردار اور سرخ و سپید چہرے والا کیا جاتا ہے۔ یہ نام کسی انسان کا تجویز کردہ نہیں بلکہ رب العالمین کا عطا کردہ ہے۔ جبریل امین نے حضرت مریم مقدسہ مطہرہ کو جب بچے کی پیدائش کی بشارت دی تو اللہ کا یہ حکم بھی پہنچا دیا۔ اِسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ
"اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔"

(آل عمران ۴۵)

انجیل لوقا کا بھی بیان قرآن سے ملتا ہے۔ مقدس لوقا فرشتے کی بشارت میں یہ الفاظ بھی لکھتا ہے۔ "اور دیکھ تو حاملہ ہو گئی ہے۔ اور تیرے بیٹا ہوگا تو اس کا نام یسوع رکھے گی"۔

(لوقا۔ ۱:۳۱)

انجیل برنباس میں بھی یہ الفاظ ملتے ہیں۔ لیکن قدرے مختلف ہیں۔ برنباس لکھتا ہے۔ "فرشتے نے جواب دیا اس نبی کی تو حاملہ ہو جا جس کا نام تو یسوع رکھنا"

(صفحہ ۲۸ پیدائش کا بیان)

لقب

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا لقب المسیح ہے۔ عبرانی اور عربی کے کئی الفاظ کی بناوٹ ایک جیسی ہے۔ اور کافی حد تک گرائمر بھی ملتی جلتی ہے۔ المسیح مسح سے مشتق اسم صفت کا صیغہ ہے۔ عیسائی اسے اسم مفعول کے معنی میں لیتے ہیں۔ جبکہ مسلمان مفسرین میں سے اکثر نے اسے اسم

فاعل کے معنی میں لیا ہے۔
اگر المسیح بمعنی الممسوح ہو تو بائبل کی رو سے اس کا معنی ایسا برگزیدہ شخص جیسے بلاھٹ کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا فرمایا تھا۔ اس لئے آپ کا مسیح لقب قرار پایا ہے۔ لیکن لقب مسیح بائبل میں صرف عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں۔ پہلے انبیاء اور برگزیدوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ لیکن جب بھی لفظ مسیح اکیلا بولا جاتا ہے۔ تو مراد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ھی ہوتے ہیں۔ عبرانی میں المسیح کا تلفظ الماشیخ یا المشیخ ہے۔
اگر مسیح اسم فاعل کے معنی میں ہو تو وجہ تسمیہ یہ ہوگی کہ آپ جس مریض پر ہاتھ پھیرتے تھے وہ صحت یاب ہو جاتا۔ بعض تفاسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک ہی وقت میں بعض اوقات ساٹھ ساٹھ ہزار مریض پیش خدمت ہوتے اور آپ کے مسح کرنے سے تمام شفاء حاصل کرتے۔ اسی وجہ سے آپ کا یہ وصف معروف ہوا کہ اس نے لقب کی صورت اختیار کر لی حضرت عبداللہ بن عباس نے رضی اللہ عنہ نے لقب مسیح کی یہی وجہ بیان کی ہے۔ (ضیاء القرآن ج ا ص۲۲۹) ایک ماخذ سیاحت بھی بیان کیا گیا۔ کیونکہ آپ تبلیغ حق کی خاطر ہمیشہ سفر میں رہتے۔ اس لئے آپ کو مسیح کا لقب ملا۔

خاندان

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام مریم بنت عمران کے بطن مبارک سے پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش معجزانہ ہے۔ حضرت مریم مقدسہ کنواری کے بطن مبارک سے قدرت خداوندی سے آپ بن باپ ہوئے۔ متی اور لوقا نے آپ کا نسب نامہ بیان کیا ہے۔ اس نسب نامے کی متی تین حصوں میں

تقسیم کرتا ہے۔ اور ہر حصے میں چودہ چودہ ناموں کا دعویٰ کرتا ہے۔ دیکھئے دونوں انجیلوں میں کس قدر تضاد ہے۔

متی کا بیان کردہ نسب نامہ مسیح	لوقا بیان کردہ نسب نامہ مسیح
(حصہ اول)	
ابراہیم	ابراہیم
اضحاق	اضحاق
یعقوب	یعقوب
یہوداہ	یہوداہ
فارص	فارص
حصرون	حصرون
ارام	ارام
عمی ناداب	عمی ناداب
نحسون	نحسون
سلمون	سلمون
بوعز	بوعز
عوبید ار عوت	عوبید ار
یسی	یسی
داود	داود

متی کا بیان کردہ نسب نامہ مسیح

(حصہ دوم)

سلیمان
رجبعام
ابی یاہ
آسا
یوشافاط
یورام
عزی یاہ
یوتام
احاز
حزقی یاہ
منسے
آمون
یوشی یاہ
یکن یاہ

لوقا بیان کردہ نسب نامہ مسیح

ناتان
متتا
منا
ملیا
الیاقیم
یونان
یوسف
یہودہ
شمعون
لاوی
متات
یورام
الی عازار
یشوع

متی کا بیان کردہ نسب نامہ مسیح

(حصہ سوم)

شالتی ایل
زروب بابل
ابی ہود
الیاقیم
عازور
صادوق
اخیم
الی ہود
الی عازار
متان
یعقوب
یوسف
یسوع

لوقا کا بیان کردہ نسب نامہ مسیح

عیر
المودام
قوسام
ادی
ملکی
نیری
شالتی ایل
زروب بابل
ریسا
یوحنا
یہودہ
یوسف
شمعی
متت یاہ
مات
نجائی
حسلی
نحوم
عاموس

متتیاہ

یوسف

ینا

ملکی

لاوی

متات

عالی

یوسف

یسوع

۱۔ یہ دونوں نسب نامے حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات سے منسوب ہیں۔ متی کے بیان کردہ نصب نامہ میں ناموں کی تعداد اکتالیس ہے۔ اور لوقا کے نزدیک ۵۲ ہے۔ یقیناً متی نے گیارہ نام چھوڑ دیئے ہیں۔

۲۔ پہلے حصے میں دونوں نسب نامے متفق ہیں۔ لیکن دوسرے حصے میں تمام ناموں میں تضاد ہے۔

۳۔ تیسرے حصے میں متی کے بیان کردہ ناموں کی تعداد ۱۳ ہے حالانکہ متی دعویٰ کرتا ہے کہ اس حصے میں ناموں کی تعداد چودہ ہے اس کے برعکس تیسرے حصے میں لوقا کی بیان کردہ تعداد ۲۹ ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ اس حصے میں صرف چار ناموں (شالتی ایل' زروب بابل' یوسف اور یسوع) میں اتفاق ہے۔

۴۔ حصہ سوئم میں شالتی ایل اور زروب بابل دونوں نسب ناموں میں موجود ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں شخصیات مشہور و معروف ہیں اور ان کی ہم نام دوسری شخصیات بائیبل میں مذکور نہیں ہیں۔

۵۔ متی نے شالتی ایل کو یکن یاہ کا بیٹا لکھا ہے۔ جبکہ لوقا کے نزدیک یہ نیری کا بیٹا ہے۔

۶۔ زروب بابل کے بیٹے کا نام متی کے نزدیک ابی ہود ہے جبکہ لوقا کے نزدیک "ایسا"

۷۔ متی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ شالتی ایل یکن یاہ کا بیٹا ہے جبکہ یرمیاہ باب نمبر ۲۲ آیت نمبر ۳۰ کے مطابق یکن یاہ بے اولاد ہے۔

متی اور لوقا نے بالاتفاق زروب بابل کو شالتی ایل کا بیٹا لکھا ہے لیکن وہ فدایاہ کا بیٹا ہے شالتی ایل کا بیٹا نہیں دیکھئے (۱۔ تواریخ ب ۳: ۱۸' ۱۹)

۹۔ متی کے نزدیک یوسف یعقوب کا بیٹا ہے جبکہ لوقا کے نزدیک

عالی کا۔

مذکورہ نقاط کو دیکھنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کا نسب نامہ مسیحیوں کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے۔ مسیحی حضرات اس تضاد بیانی کے مختلف جواب دیتے ہیں۔ لیکن عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق کوئی بات معقول نظر نہیں آتی۔

مسیح علیہ السلام کے نسب پر طعن

بدطینت یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کا انکار کیا اور حضرت مریم مقدسہ مطہرہ زکیہ کی عصمت مآب شخصیت پر الزام لگایا نعوذ باللہ من ذالک عیسائی حضرات حضرت مسیح علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کے قائل ہیں اور ان کی والدہ ماجدہ کو نہایت ہی عزت و تکریم کی حامل شخصیت قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ بھی ایک اعتبار سے آپ کے نسب میں طعن کرتے ہیں۔ متی اور لوقا کے بیان کردہ نسب ناموں میں بعض ایسے نام بھی آتے ہیں جن پر ولد الزنا ہونے کا صریح حکم بائیبل میں موجود ہے۔

الف۔ دونوں نسب ناموں کے حصہ اول کا پانچواں نام فارص ہے۔ فارص کے متعلق بائبل کا بیان ہے کہ وہ ولد الزنا ہے۔ فارص کی ماں کا نام تامار ہے۔ تامار کا خاوند عیر جو یہودہ کا پہلوٹھا تھا فوت ہو گیا۔ تامار نے اولاد حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ آخر اس نے یہ حربہ استعمال کیا کہ چپکے سے بیوگی کے کپڑے اتارے' اچھا لباس پہنا' برقعہ اوڑھا اور اس راہ پر جا بیٹھی جس راہ پر سے اس کے سسر یہودہ کا گزر ہوتا تھا۔ یہودہ نے اسے فاحشہ سمجھا اور اس سے زنا کرنے کا ارادہ کیا۔ عورت

نے معاوضہ طلب کیا۔ یہودہ کے پاس فوری طور پر معاوضہ نہیں تھا اس لئے اس نے اپنی انگوٹھی اور عصا رہن رکھے اور زنا کیا۔ یہودہ کے جانے کے بعد تامار نے گھر کی راہ لی۔ کپڑے اتارے اور بیوگی کا لباس پہن لیا۔ یہودہ کا غلام رہن چھڑانے کے لئے اسے ڈھونڈتا رہا لیکن مایوس ہو کر واپس آگیا۔ تین ماہ بعد جب یہودہ کو خبر ملی کہ تامار نے زنا کیا ہے اور وہ حمل سے ہے۔ تو سسر نے بہو تامار کو جلانے کا حکم دیا لیکن عورت نے انگوٹھی اور عصا دکھا کر سسر پر واضح کر دیا کہ یہ حمل اسی کا ہے۔ یہودہ نے اسے معاف کیا۔ تامار کے بطن سے دو بچوں نے جنم لیا ایک کا نام فارص دوسرے کا نام زارح رکھا گیا۔

(تکوین باب ۳۸ مکمل)

یہودہ اور تامار کا یہ قصہ اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے بائبل کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ اللہ کے نیک بندوں پر کیسے کیسے نازیبا الزامات لگائے گئے ہیں۔

(ب) ناتاں کی والدہ کا نام بت سابع ہے۔ ۲ سیموئل ۱۱:۳ کے مطابق حضرت داؤد نے بنت سابع کو نہاتے دیکھا۔ اس کا خاوند حضرت داؤد کا وفادار جرنیل تھا۔ نعوذ باللہ من ذالک حضرت داؤد نے بنت سابع سے زنا کیا۔ آپ علیہ السلام نے اس عورت کے خاوند کو قتل کروا دیا۔ عورت نے بتایا کہ وہ داؤد علیہ السلام سے حاملہ ہے۔ حضرت داؤد نے اسے اپنے حرم میں داخل کیا بچہ پیدا ہوا لیکن فوت ہوا۔ ناتاں بت سابع کے بطن سے حضرت داؤد کا بیٹا ہے۔ یہ الزام نہ صرف حضرت داؤد کی سیرت طیبہ کو داغدار کرنے کی کوشش ہے۔ بلکہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی ذات والا صفات کے نسب مبارک پر بھی طعن ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام

جیسے جلیل القدر رسول کی امہات میں بنت سابع جیسی فاحشہ عورتیں کیسے آسکتی ہیں۔ ممکن ہے بنت سابع عصمت ماب عورت ہو اور جس طرح حضرت داؤد اور دوسرے برگزیدہ شخصوں پر جیسے الزام لگائے گئے ہیں اس پر بھی یہ محض الزام ہو۔ کم از کم حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالے سے تو یہ الزام ہے۔

(ج) اسی طرح روت: ۳:۱۰ کے مطابق عوبید کی ماں راعوت چاہتی تھی کہ بوعز سے ہم بستر ہو لیکن وہ نہ مانا اور نکاح کیا۔

اسلام کا یہ احسان عظیم ہے کہ اہل کتاب نے انبیاء پر جو الزامات عائد کیے اسلام نے ان کی قلعی کھولی اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کی عصمت کو عیاں کیا۔

www.OnlyOneOrThree.com

پیدائش (قرآن اور انجیل کے حوالے سے)

قرآن حکیم اور بائبل مقدس نے آپ کی پیدائش کو ایک عظیم معجزے کی حیثیت سے بیان کیا۔ قرآن کریم حضرت حنہ والدہ مریم کی منت سے شروع کرتا ہے۔

حضرت حنہ کی منت

تالمود میں والدہ مریم کا اسم گرامی حنہ مرقوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ شریعت کی پابند نہایت ہی پاکباز اور للہیت کی حامل خاتون تھیں۔ حضرت حنہ نے جب حمل کی گرانی محسوس کی تو تشکر و امتنان کے جذبات امنڈ آئے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی "اے میرے پروردگار! میں نظر مانتی ہوں تیرے لئے جو میرے شکم میں ہے" (سب کاموں سے) آزاد کر کے۔

(آل عمران ۳۵)

حضرت حنہ کا خاوند عمران جو اپنی بلندی اخلاق اور حسن کردار کی وجہ سے بنی اسرائیل میں مشہور تھا بچے کی پیدائش سے قبل ہی راہی ملک بقا ہوا۔ حضرت حنا کے ہاں ایک بچی نے جنم لیا۔ بصد یاس و حسرت عرض کی "اے رب میں نے تو جنم دیا ایک لڑکی کو"

(آل عمران ۳۶)

اب ایک بچی تیرے گھر کی خدمت کیسے کرے گی۔ بارگاہ ایزدی سے فرماں ہوا "اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا اور نہیں تھا لڑکا (جس کا وہ سوال کرتی تھی) مانند اس لڑکی کے"۔

(آل عمران ۳۶)

حضرت حنہ تسلی بخش جواب سن کر مطمئن ہو گئیں اور عرض کی "میں نے نام رکھا اس کا نام مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے"۔

(آل عمران ۳۶)

مریم کی کفالت

حضرت حنہ نے بچی کو اٹھایا اور اپنی منت پوری کرنے کی غرض سے ہیکل میں تشریف لے گئیں۔ ہیکل میں موجود عبادت گزاروں میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ عمران کی بچی کی پرورش کی سعادت وہ حاصل کرے۔ آخر طے پایا کہ اس نزاع کا تصفیہ قرعہ اندازی سے کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یہ واقعات غیب کی خبروں میں سے ہیں۔ ہم وحی کرتے ہیں ان کی آپ کی طرف اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب پھینک رہے تھے وہ

(مجاور) اپنی قلمیں (یہ فیصلہ کرنے کے لیے) کہ کون ان میں سے سرپرستی کرے مریم کی اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے"۔

(آل عمران ۴۴)

قرعہ اندازی کی گئی۔ حضرت زکریا کے نام قرعہ نکلا اور یہ ذمہ داری حضرت زکریا علیہ السلام کو مل گئی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی گھر مریم کی خالہ تھیں۔ جن کا نام ایشع ہے۔ ایشع حضرت یحیی علیہ السلام کی والدہ ہیں۔ حضرت مریم اور حضرت یحیی علیہ السلام خالہ زاد ہیں۔ ایشع نے اس ذمہ داری کو خوب نبھایا۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے بچی کی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی بعض مفسرین نے لکھا ہے۔ کہ حضرت مریم کی پرورش میں خصوصی الہی قدرت کارفرما تھی وہ عام بچوں کی طرح نہیں بڑھیں بلکہ چند ماہ میں جوانی کی عمر میں پہنچ گئیں۔ شاید اسی لئے قرآن نے کہا ہے۔ "اور پروان چڑھایا اسے اچھا پروان چڑھانا"

(آل عمران ۳۷)

مریم کی کرامت

حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم کے لئے بیت المقدس میں ایک حجرہ مخصوص کر دیا جو مشرق کی جانب تھا مشرقی جانب کے حجرے عورتوں کے لئے مخصوص تھے حضرت مریم نے یکسوئی حاصل کرنے کے لئے پردہ لٹکا دیا جیسا کہ عام طور معتکفین کا طریقہ ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ "اور اے حبیب! بیان کیجئے کتاب میں مریم (کا حال) جب وہ الگ ہو گئیں۔ اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو مشرق کی جانب تھا پس بنا لیا اس نے

لوگوں کی طرف سے ایک پردہ"

(مریم ۱۸)

حضرت زکریا علیہ السلام جب باہر جاتے تو دروازہ بند کر دیتے۔ اور جب واپس آکر کھولتے تو حضرت مریم کے پاس بے موسم کے عمدہ پھل پاتے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔ "جب بھی جاتے مریم کے پاس زکریا (اس کی) عبادت گاہ میں تو موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں"

(آل عمران ۳۷)

حضرت زکریا نے ایک دن پوچھ لیا "اے مریم کہاں سے تمہارے لئے پھل آتا ہے یہ (رزق)" مریم نے جو جواب دیا وہ نبی کی تربیت یافتہ ہی دے سکتی ہے۔ نیز حضرت مریم کے الفاظ ان کی کرامت پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ "عرض کی یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ بے حساب"

(آل عمران ۳۷)

بشارت مسیح

حضرت مریم پوری یکسوئی اور انہماک سے عبادت خداوندی میں مصروف تھیں۔ آپ کی کرامات زبان زد خاص و عام تھیں۔ تمام لوگ آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حضرت مریم کے حجرے میں گاہ بگاہ زکریا علیہ السلام تشریف لاتے تھے۔ آپ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھیں لیکن عفت و عصمت کا یہ عالم تھا کہ غیر کی طرف نگاہ تو کجا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ ایک دن اچانک حضرت مریم کیا دیکھتی ہیں کہ ان کے بالکل قریب حجرے کے اندر ایک خوبصورت توانا نوجوان کھڑا ہے۔ عفت مآب

مریم گھبرا گئیں۔ فوراً" اس نوجوان نے کہا "میں پناہ مانگتی ہوں رحمٰن کی تجھ سے اگر تو پرہیز گار ہے"

(مریم ۱۸)

جبرئیل امین جو ایک نوجوان کی شکل میں آئے تھے نے اپنے آپ کو متعارف کروایا اور کہا مریم! "میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تجھے عطا کروں ایک پاکیزہ فرزند"

(مریم ۱۹)

مریم (حیرت سے) بولیں (اے بندہ خدا) کیونکر ہو سکتا ہے میرے ہاں بچہ حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی بشر نے اور نہ میں بدچلن ہوں"

(مریم ۲۰)

"جبرائیل امین نے کہا یہ درست ہے (لیکن) تیرے رب نے فرمایا یوں بچہ دینا میرے لئے معمولی بات ہے اور (مقصد یہ ہے) کہ بنائیں اسے اپنی قدرت سے نشانی لوگوں کے لئے اور سراپا رحمت اپنی طرف سے اور یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔"

(مریم ۲۱)

سورۃ آل عمران میں جبرائیل امین کی جگہ جمع کا لفظ الملائکہ ہے اور بشارت کے الفاظ بھی مختلف ہیں۔ "جب کہا فرشتوں نے اے مریم! اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے تجھے ایک حکم کی اپنے پاس سے اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہو گا۔ معزز ہو گا دنیا اور آخرت میں اور اللہ کے مقربین میں سے ہو گا۔ اور گفتگو کرے گا۔ لوگوں کے ساتھ گہوارے میں بھی اور پکی عمر میں بھی اور نیکو کاروں میں سے ہو گا...... اور اللہ تعالیٰ سکھائے گا۔ اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل اور (بھیجے گا اسے) رسول بنا کر بنی

اسرائیل کی طرف۔ (وہ انہیں آکر کہے گا کہ) میں آگیا ہوں تمہارے پاس ایک معجزہ لے کر تمہارے رب کی طرف سے۔ (وہ معجزہ یہ ہے کہ) میں بنا دیتا ہوں تمہارے لئے کیچڑ سے پرندے کی صورت پھر پھونکتا ہوں اس (بے جان صورت) میں تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ پرندہ اللہ کے حکم سے اور میں تندرست کر دیتا ہوں۔ مادر زاد اندھے کو اور (لاعلاج) کوڑھی کو اور میں زندہ کرتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے اور بتلاتا ہوں تمہیں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم جمع رکھتے ہو اپنے گھروں میں۔ بے شک ان معجزوں میں (میری صداقت کی) بڑی نشانی ہے۔ تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو۔ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اپنے پہلے آئی ہوئی کتاب تورات کی اور تاکہ میں حلال کر دوں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو (پہلے) حرام کی گئی تھیں تم پر اور لایا ہوں تمہارے پاس ایک نشانی تمہارے رب کی طرف سے۔ سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے اور مجھے مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے تمہیں سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے"۔ (آل عمران ۴۵ تا ۵۱)

لگتا ہے حضرت جبرائیل امین پہلے انسانی صورت میں تشریف لائے اور بشارت کے وہ الفاظ کہے جو سورۃ مریم میں مذکور ہیں۔ پھر کئی فرشتوں نے آکر مزید تسلی کے لئے تفصیل سے مولود مسعود کے اوصاف بھی بیان کر دیے۔ کیونکہ کنواری ہونے کے باوجود بچے کی پیدائش حضرت مریم کے لئے بہر حال بہت ہی صبر آزما مرحلہ تھا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

پیدائش مسیح علیہ السلام انجیل کے حوالے سے:

انجیل مرقس اور انجیل یوحنا نے سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیدائش

کو بیان نہیں کیا۔ مقدس مرقس مسیح علیہ السلام کے بپتسمہ سے شروع کرتا ہے۔ یوحنا کا انداز خالصتاً فلسفیانہ ہے۔ اور اس کے ابتدائی جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام ازلی ہستی ہیں۔ جو روح القدس کی قدرت سے مریم علیہا السلام کے بطن مبارک سے تولد ہوئے اور غیر فانی ٹھہرے۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے یونانی متن کا حوالہ دے کر ثابت کیا ہے کہ معنی میں تحریف کی گئی ہے۔ متن کے الفاظ سے مسیح علیہ السلام کی ازلیت ثابت نہیں ہوتی۔

متی میں نہایت ہی اختصار سے کام لیتے ہوئے معجزانہ پیدائش کو بیان کیا گیا ہے۔ فرشتوں کی بشارت کا کہیں ذکر نہیں۔ متی اتنا ذکر کرتا ہے کہ مریم مقدسہ منگنی کے بعد اکٹھے ہونے سے پہلے حاملہ ہو گئی۔ یوسف نے چپکے سے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا لیکن خواب میں اصل حقیقت پر آگاہی ہوئی تو ہو مریم کو گھر لے آئے اور پیدائش تک الگ رہے۔ اس طرح مریم تہمت سے بچ گئی۔ یہ معجزانہ پیدائش صیغہ راز میں رہی۔ عام لوگ مسیح علیہ السلام کو یوسف کا حقیقی بیٹا یقین کرتے ہیں۔ لوقا جبرائیل امین کی بشارت کا ذکر کرتا ہے۔ مقدس لوقا کا بیان قرآن کریم سے بہت مطابقت رکھتا ہے۔

"اور چھٹے مہینے جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے جلیل ایک شہر میں بھیجا گیا۔ جس کا نام ناصرت تھا۔ داؤد کے گھرانے کی ایک کنواری کے پاس جو یوسف نامی ایک مرد سے بیاہی ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا۔ اور فرشتے نے اس کے پاس اندر آکر کہا۔ سلام اے پر فضل۔ خداوند تیرے ساتھ ہے تو عورتوں میں مبارک ہے۔ وہ اس کلام سے گھبرا گئی اور

سوچنے لگی کہ یہ کیسا سلام ہے۔ اور فرشتے نے اس سے کہا کہ اے مریم تو نہ ڈر کیونکہ تو نے خدا کے نزدیک فضل پایا ہے۔ اور دیکھ تو حاملہ ہو گئی ہے اور تیرا بیٹا ہو گا اور تو اس کا نام یسوع رکھے گی۔ وہ بڑا ہو گا اور حق تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا۔ اور خداوند خدا اس کے باپ داؤد کا تخت اسے دے گا۔ اور وہ یعقوب کے گھرانے میں ہمیشہ تک بادشاہی کرے گا اور اس کی بادشاہی کا آخر نہ ہو گا تب مریم نے فرشتے سے کہا یہ کس طرح ہو گا۔ جب کہ میں مرد سے ناواقف ہوں اور فرشتے نے جواب میں اس سے کہا روح القدس تجھ پر نازل ہو گا۔ اور حق تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی اور اس سبب سے وہ قدوس مولود خدا کا بیٹا کہلائے گا"

(لوقا ب ۱: ۲۶ تا ۳۶)

اس بیان میں اور قرآن کریم کے بیان میں کلی مطابقت نہیں لیکن بہت حد تک بشارت موجود ہے۔

مسیح علیہ السلام کی دنیا میں پہلی آمد

سورۃ مریم میں آپ علیہ السلام کی آمد کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ "فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا۔ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا۔ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا۔

(مریم ۲۲ تا ۲۶)

ترجمہ:۔ پس وہ حاملہ ہو گئیں اس (بچہ) سے پھر وہ چلی گئیں اسے (شکم میں) لئے کسی دور جگہ پس لے آیا انہیں درد زہ ایک کھجور کے تنے کے پاس (بصد حسرت و یاس) کہنے لگیں کاش! میں مرگئی ہوتی اس سے پہلے اور بالکل فراموش کردی گئی ہوتی۔ پس پکارا اسے ایک فرشتہ نے اس کے نیچے سے (اے مریم) غمزدہ نہ ہو جاری کردی ہے تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی اور ہلاؤ اپنی کھجور کے تنے کو۔ گرنے لگیں گی تم پر پکی ہوئی کھجوریں (میٹھے میٹھے خرمے) کھاؤ اور (ٹھنڈا پانی) پیو اور (اپنے فرزند دلبند کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پہلے ہی مریم کو بچے کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کردیا گیا تھا تو وہ یاس و حسرت کی تصویر بنے واویلا اور مایوسی کی گفتگو کیوں کر رہی تھیں۔ میرے خیال میں یہ انداز حضرت مریم کے کمال عفت پر دلالت کرتا ہے۔ کنواری کے ماں بن جانے پر لوگ تہمت لگائیں گے۔ حقیقت کا بیان کربھی دیا گیا تو کون یقین کرے گا۔ اگر عام عورت ہوتی تو اس قدر پریشان نہ ہوتی۔ یہ مریم تھی جس کا پورا خاندان عزت و عظمت کردار کا نمونہ تھا۔ بن باپ کے بچے کی پیدائش پر وہ لوگوں کا سامنا کیسے کرے گی؟ اسی لئے اس کی زبان سے ایسے الفاظ نکل گئے۔

اللہ نے مریم مقدسہ کو حکم دیا "فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا"

(مریم:۲۶)

"پھر اگر تم دیکھو کسی آدمی کو تو (اشارے سے اسے) کہو کہ میں نے نذر مانی ہوئی ہے۔ رحمٰن کے لئے (خاموشی کے) روزہ کی پس میں آج کسی انسان سے گفتگو نہیں کروں گی۔"

مریم علیہا السلام قوم کا سامنا کرتی ہیں:

حضرت مریم جب چلنے پھرنے کے قابل ہو گئیں تو بچے کو گود میں لئے اپنی قوم کے پاس تشریف لائیں۔ قرآن کریم کے الفاظ ہیں۔ "فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا" "پس وہ لے آئیں بچہ کو اپنی قوم کے پاس (گود میں) اٹھائے ہوئے"۔

(مریم ۲۷)

بہتان عظیم

مریم تقدس مآب خاندان کی تقدس مآب کنواری تھیں۔ پوری قوم میں ان کی پاکیزگی کی دھوم تھی۔ اچانک اس کی گود میں بچہ دیکھ کر قوم پر سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور فرط خجالت سے بس اتنا کہہ سکے یٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا۔ (مریم ۲۷) "اے مریم! تم نے بہت ہی برا کام کیا ہے" مریم علیہا السلام ہارون کی بہن نہیں لیکن اسی نسل سے تھیں اس لئے قوم نے جب بن باپ کے اس مولود مسعود کو دیکھا تو سمجھ نہ سکے اور آپے سے باہر ہو کر کہنے لگے۔ يٰاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا۔ (مریم ۲۸) "اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدچلن تھی" حضرت مریم کو خاندانی شرافت کا احساس دلایا جا رہا تھا کہ تو جس قوم اور جس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس کے اخلاق عالیہ سے زنا جیسے گھناؤنے گناہ کا ارتکاب ناممکن ہے پھر تو نے یہ جرات کیسے کی۔

قرآن کریم کی اس آیت سے اناجیل کے اس قصہ کی قلعی کھل جاتی ہے کہ مریم یوسف کے گھر آچکی تھی اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش

صیغہ راز میں رہی اناجیل کے نظریے کے بطلان کے کئی دلائل ہیں۔[1]

۱۔ یہودیوں نے مسیح علیہ السلام کے اعلان نبوت کے ساتھ ہی ان پر اور ان کی والدہ ماجدہ پر بہتان باندھنا شروع کر دیا کہ نعوذ باللہ مریم زانیہ اور یسوع ولد الزنا ہیں۔ اگر یہ پیدائش صیغۂ راز میں ہوتی تو انہیں کبھی یہ جرات نہ ہوتی۔

۲۔ یہ پیدائش ایک معجزہ تب قرار پا سکتی ہے۔ جب کہ عام لوگ اس سے واقف ہوں کیونکہ معجزہ قدرت خداوندی کی دلیل ہوتا ہے اور اس کے صدور سے مقصود انسانوں کی ہدایت ہوتی ہے۔ یہ معجزہ کی حیثیت تب ہی حاصل کر سکتی ہے۔ جب کہ لوگ اسے کنواری کے بدن سے بن باپ دیکھیں۔

یوسف کے گھر یہ پیدائش مقصد کو کھو دیتی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اناجیل کے مصنفین کی یہ غلطی ہے۔

۴۔ خود مسیح علماء نے بائیبل میں تحریف کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ان بیانات کو شک و شبہ سے بالاتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بہرحال حضرت مریم مقدسہ پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ اور ان کی قوم نے انہیں رد کر دیا۔

مریم کی برات

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے مریم علیہا السلام نے اپنی صفائی میں ایک لفظ تک نہ کہا۔ ان کے الزامات کے جواب میں فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ "مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیا"۔

مریم ۲۹؛

لوگ اور زیادہ غصے میں آگئے اور "قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا "کہنے لگے ہم کیسے بات کریں اس سے جو گہوارہ میں (کم سن) بچہ ہے" مریم تو توا تنی بے باکی کا مظاہرہ کرتی ہے اور ہمیں بیوقوف بناتی ہے۔لوگ مریم کو کوس رہے تھے کہ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے خودان کی برأت کا سامان کردیا ہوایوں تکلم في المهد کہ جھولے میں جھوٹا چند دن کا بچہ گویا ہوا "اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا۔ وَبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا۔ وَ السَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا۔

(مریم ۳۰ تا ۳۳)

"میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے اور اسی نے مجھے بابرکت کیا ہے۔ جہاں کہیں بھی میں ہوں اور اسی نے مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوۃ دینے کا جب تک میں زندہ رہوں اور مجھے خدمت گزار بنایا اپنی والدہ کا اور اس نے نہیں بنایا مجھے جابر (اور) بدبخت اور سلامتی ہو مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس مجھے اٹھایا جائے گا زندہ کر کے"۔

ایک بچے کی حکمت بھری گفتگو سن کر لوگوں کو یقین آگیا کہ انبیاء کی بشارتوں کا مصداق اسرائیلی سلسلہ نبوت کا آخری رسول تشریف لایا ہے۔ یقیناً" مریم کی تعظیم و تکریم میں اور اضافہ ہوا ہو گا مولود مسعود کی پیدائش پر خوشیاں منائی گئی ہوں گی

اعتراض

اس صریح معجزہ کو دیکھ لینے کے باوجود مسیح علیہ السلام کی مخالفت کیوں کی گئی۔ اناجیل اربعہ کا بیان قابل وثوق ہے کہ لوگ انہیں مریم اور یوسف کے بیٹے کی حیثیت سے جانتے تھے۔

جواب

اس اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں۔ مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے سامنے اس کے علاوہ کتنے معجزے پیش کیے لیکن بنی اسرائیل نے ان کی صداقت کو تسلیم نہیں کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ملاحظہ کرنے کے باوجود خدا سے براہ راست حکم لینے اور خدا کو دیکھنے کی خواہش کی۔ انبیاء کو مان لینے پر بھی انہیں قتل کیا اور اپنی تحریروں میں لکھا کہ ہم نے فلاں نبی کو قتل کر دیا کیونکہ وہ ہمیں برائیوں پر ٹوکتا تھا۔

اعتراض:

تکلم فی المھد کے معجزے کو بائبل نے بیان نہیں کیا۔ انجیل برنباس میں مسیح علیہ السلام یوسف نجار کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اور ان کی معجزانہ پیدائش صیغہ راز میں رہتی ہے۔ پورا مسیحی لٹریچر اس معجزے کے بیان سے خالی ہے۔ اس لئے مسیحی حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تکلم فی المھد کا بیان جعلی ہے۔ اگر مسیح علیہ السلام نے یہ معجزہ دکھایا ہوتا تو اس عظیم معجزے سے مسیحی دنیا ضرور واقف ہوتی۔ دوسری اقوام نے خصوصاً یہودیوں نے جہاں مسیح کے دوسرے معجزات کا رد کیا ہے وہاں اس معجزہ کا بھی رد کرتی۔ لیکن اس معجزے کا تذکرہ مسلمانوں کے سوا کسی

مذہب میں نہیں ملتا۔

جواب:

علامہ ابو عثمان عمرو بن بحر جو کہ جاحظ کے نام سے مشہور ہیں اپنی کتاب "المختار فی الرد علی النصاریٰ" میں اس کا تفصیلی جواب دیتے ہیں۔ ذیل میں گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

دوسرے مذاہب کا اس معجزے کو تسلیم نہ کرنا اس کے عدم وقوع کی دلیل نہیں ہے ورنہ عیسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات کا انکار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ دوسرے مذاہب تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات کا انکار کرتے ہیں۔ مثلاً یہود تو آپ کو مکار، دغاباز اور (نعوذ باللہ) حضرت مریم کے گناہ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ تو کیا ان کی اس یاوہ گوئی اور بے ہودگی کی انتہا کو ہم دلیل قرار دے کر حضرت مریم کی عظمت کردار کا انکار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح زرتشی مذہب رکھنے والے تورات، انجیل اور صحائف کے الہامی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ تو کیا ان کا انکار کوئی وزن رکھتا ہے۔ اس لیے دوسرے مذاہب کا انکار یا خاموشی ہرگز دلیل نہیں ہے۔ ہاں عیسائی حضرات مسیح علیہ السلام کے معجزات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان کی پیروی اور محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مسیحیوں نے مسیح علیہ السلام کے معجزات کو خوب بیان کیا ہے۔ ان کا انکار ایک وزنی دلیل ہے۔ اس اعتراض کا جواب دینا ضروری ہے۔

علامہ جاحظ فرماتے ہیں کہ مسیحیوں نے دین چار آدمیوں سے حاصل کیا ہے ان کی رائے میں دو (یوحنا اور متی) حواری ہیں اور دو (مرقس اور لوقا) حواری نہیں۔ ممکن ہے بتقاضا بشری ان سے غلطی ہو گئی

ہو اور انہوں نے اس معجزہ کو نہ لکھا ہو تا کہ غیر معتاد واقعہ سے لوگ متنفر ہو کر عیسائیت سے دور نہ ہو جائیں۔

اعتراض:

مسیحی حضرات کے نزدیک مصنفین ملہم تھے۔ ایک ملہم ہرگز غلطی نہیں کر سکتا۔ بشری تقاضوں پر قدرت خداوندی غالب آجاتی ہے۔

جواب:

علامہ جاحظ نے جواب کا اعتراض دیتے ہوئے کہا ہے کہ اناجیل کا باہمی تضاد ثابت کرتا ہے کہ مصنفین ملہم نہیں تھے اور ان سے غلطیاں ہوئی ہیں۔

(المختار فی الرد علی النصاریٰ۔ علامہ جاحظ۔ ص ۹۷ تا ۱۰۰)

کیا مصنفین مداہن تھے

علامہ جاحظ کی نظر میں مصنفین اناجیل نے مداہنت سے کام لیا ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص اسے تعصب پر محمول کرے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ بائبل سے مداہنت کی چند مثالیں پیش کر دوں۔

پولس جو مسیحیت کا بانی ہے قرنتیوں کے نام خط میں لکھتا ہے۔

"میں یہودیوں کے درمیان یہودیوں کی طرح بنا تا کہ میں یہودیوں کو حاصل کر سکوں اہل شریعت کے لئے میں اہل شریعت کی طرح بنا (گو میں شریعت کے تابع نہیں) تا کہ اہل شریعت کو حاصل کر سکوں۔ بے شرعوں کے لئے بے شرع بنا (گو میں خدا کی شریعت کے بغیر نہیں تھا بلکہ مسیح کی شریعت کے تابع تھا) تا کہ بے شرعوں کو حاصل کر سکوں......... (۱۔ قرنتیوں ۹: ۲۰ تا ۲۱)

وہ مسیح جو یہودی النسل تھے اور فریسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے مسیحیت کو قبول کرنے کے بعد بھی موسوی شریعت کی پابندی کو لازمی سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس غیر اقوام کے لوگ شرع موسوی کی پابندی سے آزادی کے قائل تھے۔ پولس کی یہ کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ مسیحیت کو قبول کریں اس کے لئے خواہ کتنی ہی قربانی دینا پڑے رومیوں کے نام ایک خط میں پولس اول مسیحیوں کے اس باہمی اختلاف کے تصفیہ کی صورت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "پس ہم میں سے ہر ایک خدا کو اپنا حساب دے گا" اس لئے چاہئے کہ آئندہ ہم ایک دوسرے پر عیب نہ لگائیں بلکہ تم یہ تجویز کرو کہ وہ چیز جو ٹھوکر یا گرنے کا باعث ہو اپنے بھائی کے سامنے نہ رکھو۔

(رومیوں ۱۴: ۱۲ تا ۱۴)

پولس کی کوشش تھی کہ وہ چیز جو ٹھوکر یا گرنے کا باعث ہو یعنی مسیحیت سے دوری کا باعث بن رہی ہو اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس لئے تکلم فی المھد کے معجزے کو "داخلتا" چھوڑنے کے قوی امکانات موجود ہیں۔

دوسرا جواب

دوسرا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ مصنفین نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے تمام معجزات اور تعالیم کو قلمبند نہیں کیا۔ لہٰذا تکلم فی المھد کے معجزے کو من گھڑت کہنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

انجیل یوحنا تمام الہامی تحریروں کے بعد تصنیف ہوئی ہے۔ مقدس یوحنا اس کے آخر میں اعتراف کرتا ہے کہ

"اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کئے ہیں۔ اور اگر وہ جدا

جدا لکھے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں کہ کتابیں جو لکھی جاتیں دنیا میں سما نہ سکتیں"۔

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اناجیل اربعہ میں تکلم فی المہد کے معجزے کا نہ ہونا اس کے جعلی ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ممکن ہے بہت سارے دوسرے معجزات کی طرح یہ معجزہ بھی احاطہ تحریر میں نہ لایا گیا ہو۔

قرآن کریم میں موجود سیدنا عیسیٰ علیہ اسلام کی گفتگو میں چند امور قابل توجہ ہیں۔

۱۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اناجیل اربعہ میں جگہ جگہ آپ علیہ السلام کی یہ تعلیم موجود ہے۔ تفصیل بعد میں پیش کی جائے گی۔

۲۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے کتاب دی گئی ہے۔ ماضی کا صیغہ تحقق وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ (ضیاء القرآن) کتاب سے مراد کیا اناجیل اربعہ ہیں؟ انجیل برنباس ہے یا کوئی اور کتاب؟ تفصیل بعد میں آئے گی۔

۳۔ يَوْمَ أَمُوتُ وَأُبْعَثُ حَيًّا کے الفاظ سے تصلیب' عقیدہ کفارہ اور عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید ہوتی ہے۔ اناجیل اربعہ کے حوالے سے ثابت کیا جائے گا کہ مسیح مصلوب نہیں ہوئے۔

مولود مسعود کے حضور سجدہ تعظیمی

بائبل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلے میں دو اور معجزات کو بیان کیا ہے ہم ان معجزات کو موضوع قرار نہیں دیتے کیونکہ قرآن نے تمام معجزات کا احاطہ نہیں کیا۔

متی مجوسیوں کی آمد اور رسالت ماب حضرت سیدنا مسیح کے حضور

سجدے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "اور جب یسوع ہیرودیس بادشاہ کے وقت یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا تو دیکھو مشرق کے کئی مجوسیوں نے یروشلم میں آکر کہا کہ یہودیوں کا بادشاہ جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے کیونکہ ہم نے مشرق میں اس کا ستارہ دیکھا اور اسے سجدہ کرنے آئے ہیں۔ جب ہیرودیس بادشاہ نے یہ سنا تب وہ اور اس کے ساتھ تمام یروشلم گھبرایا۔ تب اس نے سب سردار کاہنوں اور قوم کے فقیہوں کو جمع کرکے ان سے پوچھا کہ مسیح کہاں پیدا ہونا چاہیے؟ انہوں نے اس سے کہا۔ یہودیہ کے بیت لحم میں۔ کیونکہ نبی کی معرفت یوں لکھا ہے کہ

اے بیت لحم یہودہ کی سرزمین
تو یہودہ کے رئیسوں میں ہرگز کمترین نہیں
کیونکہ تجھ میں سے ایک حاکم نکلے گا
جو میری امت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا۔

تب ہیرودیس نے مجوسیوں کو چپکے سے بلا کر ان سے تحقیق کی کہ وہ ستارہ کب دکھائی دیا تھا۔ اور یہ کہہ کر ان کو بیت لحم بھیجا۔ کہ جاؤ اور اس بچے کی بابت خوب دریافت کرو۔ اور جب اسے پاؤ مجھے خبر دو۔ کہ میں بھی آکر اسے سجدہ کروں۔ وہ بادشاہ سے یہ سن کر روانہ ہوئے اور دیکھو وہ ستارہ جو انہوں نے مشرق میں دیکھا تھا ان کے آگے آگے چلا یہاں تک کہ اس جگہ کے اوپر آکر ٹھہر گیا جہاں وہ بچہ تھا۔ وہ ستارے کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور اس گھر میں داخل ہو کر اس بچے کو اس کی ماں مریم کے ساتھ پایا اور اس کے آگے گر کر اس کو سجدہ کیا۔ (متی ب2: 1تا11)

مقدس لوقا نے چرواہوں کے سجدے کا ذکر کیا ہے۔ لوقا لکھتا ہے۔

"اسی علاقے میں چرواہے تھے جو رات کو میدان میں رہتے اور اپنے گلے کی نگہبانی کرتے تھے اور دیکھو خداوند کا ایک فرشتہ ان کے پاس آکر کھڑا ہوا اور خداوند کی تجلی ان کے چوگرد چمکی اور وہ نہایت ڈر گئے۔ تب فرشتے نے ان سے کہا "دیکھو میں تمہیں بڑی خوشی کی بشارت دیتا ہوں۔ جو ساری امت کے لئے ہو گی۔ کہ آج داؤد کے شہر میں تمہارے لئے ایک منجی پیدا ہوا وہ مسیح خداوند ہے۔ اور اس کا نشان تمہارے لئے یہ ہو گا۔ کہ تم ایک ننھے بچے کو کپڑے میں لپٹا ہوا پاؤ گے اور یکایک اس فرشتے کے ساتھ آسمانی لشکر کی ایک جماعت خدا کی تعریف کرتی اور یہ کہتی ظاہر ہوئی کہ

عالم بالا پر خدا کی تمجید ہو اور زمین پر
نیک ارادے کے آدمیوں کے لئے امن
اور جب فرشتے ان کے پاس آسمان پر چلے گئے۔ تو
چرواہوں نے آپس میں کہا کہ آؤ ہم بیت لحم کو جائیں اور
اس بات کو دیکھیں جو ہوئی ہے۔ اور جس کی خداوند نے
ہمیں خبر دی ہے۔ پس وہ جلدی سے گئے اور مریم اور
یوسف اور اس ننھے بچے کو چرنی میں پڑا پایا اور دیکھ کر وہ
بات بتائی جو اس بچے کے حق میں ان سے کہی گئی تھی۔

(لوقا باب ۲ آیت ۸ تا ۱۸)

یہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں۔ ان کی صحت اور عدم صحت پر کلام کرنے کی گنجائش ہے۔ لیکن ان دونوں کو تضاد پر محمول کرنا صحیح نہیں ہو گا۔

ختانت مسیح

صرف لوقا نے مسیح علیہ السلام کی رسم ختانت کو بیان کیا ہے۔ لوقا لکھتا ہے۔ "اور جب اس کے ختنے کرانے کے لئے آٹھ دن پورے ہو گئے تو اس کا نام یسوع رکھا گیا۔ جو فرشتے نے اس کے رحم میں پڑنے سے پہلے رکھا تھا" (لوقا ۲:۲۱)

رسم طہارت

رسم طہارت کے بیان میں بھی لوقا اکیلا ہے۔ اس بیان سے حضرت مسیح کے گھر والوں کی مالی حالت پر روشنی پڑتی ہے۔ لوقا کا بیان ہے۔

"اور جب موسیٰ کی شریعت کے موافق ان کی طہارت کے دن پورے ہو گئے۔ تو وہ اس کو یروشلم میں لائے۔ تاکہ اسے خداوند کے آگے حاضر کریں۔ جیسا کہ خداوند کی شریعت میں لکھا ہے کہ ہر پہلوٹا بچہ خداوند کے لئے مخصوص ٹھہرے گا۔ اور ذبیحہ لائیں یعنی قمریوں کا ایک جوڑا یا کبوتر کے دو بچے۔ جیسا خداوند کی شریعت میں لکھا ہے۔"

(لوقا باب ۲: ۲۲ تا ۲۴)

متی اور لوقا کی تضاد بیانی

متی کے بیان کے مطابق یوسف اور مریم ہیرودیس کے خوف کی وجہ سے اللہ کے حکم سے بچے کو مصر لے جاتے ہیں۔ اور ہیرودیس کی موت تک واپس نہیں آتے۔ جبکہ لوقا کے بیان کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا آٹھویں دن ختنہ ہوا تھا۔ آپ کو یروشلم میں خدا کے حضور پیش

کیا جاتا ہے اس کے وہ گلیل کو لوٹ جاتے ہیں۔ اور شہر ناصرت میں قیام کر لیتے ہیں۔ لوقا کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ "اور جب وہ خداوند کی شریعت کے مطابق سب کچھ کر چکے تو جلیل میں اپنے شہر ناصرت کو لوٹ گئے اور وہ بچہ بڑھتا اور مضبوط ہوتا گیا......

(لوقا باب ۲: ۳۹، ۴۰)

شمعون اور حنا بنت فنوایل کا اظہار عقیدت

لوقا نے شمعون اور حنا بنت فنوایل کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ باقی تینوں اناجیل اس ضمن میں خاموش ہیں۔ لوقا کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ شمعون نامی ایک راستباز شخص بنی اسرائیل کے بقیہ میں سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب تو خدا کے ممسوح (مسیح) کو نہیں دیکھ لے گا موت کو نہیں دیکھے گا۔ مسیح کے انتظار میں ایک عرصہ بیت گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو جب ہیکل میں رسم طہارت کے لئے لایا گیا تو شمعون روح القدس سے آگاہی پا کر ہیکل میں آیا، بچے کو گود میں لیا اور حمد باری تعالیٰ کی۔

"اے میرے مالک تو اپنے قول کے مطابق اب اپنے بندے کو امن سے رخصت کرتا ہے کیونکہ میری آنکھوں نے تیری نجات دیکھ لی۔ جو تو نے سب امتوں کے روبرو تیار کی ہے۔ غیر قوموں کے لئے انکشاف کا نور اور اپنی امت اسرائیل کا جلال" (لوقا باب ۲۵ تا ۳۲)

اسی باب میں حنہ کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ لوقا نے حنہ بنت فنوایل کو نبیہ لکھا ہے۔ یہ بائیبل کا اصطلاحی لفظ ہے جو اسلامی اصطلاح کاہن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حنہ ۸۴ برس کی ہو چکی تھی اس نے بھی حضرت مسیح

علیہ السلام کی زیارت کی اور لوگوں کو مولود مسعود کے متعلق بتایا۔

(لوقاب ۲: ۳۶ تا ۴۰)

مسیح علیہ السلام کا لڑکپن

پیدائش اور اس کے متعلق چند واقعات کو بیان کرنے کے بعد چاروں اناجیل ایک طویل خاموشی اختیار کرتی ہیں۔ بچپن کے متعلق اناجیل اربع میں صرف اتنے الفاظ ملتے ہیں۔ "بچہ بڑھتا گیا اور مضبوط ہوتا گیا اور حکمت سے معمور تھا اور خدا کا فضل اس پر تھا" سب سے پہلے لوقا اس طویل خاموشی کو توڑتا ہے وہ یسوع علیہ السلام کو ۱۲ سال کی عمر میں ہیکل کے مجاوروں سے گفتگو کرتے دکھاتا ہے۔

حسب دستور مریم اور یوسف عید فصح پر یروشلم جاتے ہیں۔ عید کے بعد قافلہ گلیل کو روانہ ہو جاتا ہے۔ حضرت مسیح یروشلم رہ جاتے ہیں لیکن والدین کو اس کی خبر نہیں ملتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسیح قافلہ کے ساتھ آرہا ہے۔ ایک منزل طے کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ مسیح قافلہ کے ساتھ نہیں۔ بچے کی تلاش میں مریم اور یوسف واپس یروشلم آتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں بچہ ہیکل میں بائیبل کے جید علماء سے گفتگو کر رہا ہے اور اپنی حکمت اور دانائی سے انہیں ورطہ حیرت میں ڈالے ہوئے ہے۔ مریم اور یوسف بچے سے کہتے ہیں۔ کہ ہم کس بے چینی سے تجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ یسوع انہیں بتاتا ہے کہ تم مجھے کیوں ڈھونڈتے ہو کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرا باپ کے گھر ہونا ضروری ہے۔ شاید پہلی بار یسوع مسیح اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتا ہے۔ ابن خدا کے متعلق تفصیلی گفتگو بعد میں آئے گی۔

"اَلْاِتْیَانُ بِاَمْرٍ خَارِقٍ لِلْعَادَۃِ یُقْصَدُ بِہٖ بَیَانُ صِدْقِ مَنْ

اصطباغ مسیح

ہم دیکھتے ہیں کہ چاروں اناجیل مسیح علیہ السلام کے ابتدائی آٹھ دنوں کی سیرت کے چند واقعات کو بیان کرنے کے بعد خاموش ہو جاتی ہیں۔ درمیانی سالوں کے متعلق جو لکھا گیا ہے وہ تمام علماء کے تخیل کا نتیجہ ہے مثلاً مسیح نے بڑھئی کا کام سیکھا' ماں سے بائیبل عہد قدیم کی تعلیم و تربیت حاصل کی وغیرہ۔ سب سے پہلے لوقا اس خاموشی کو توڑتا ہے اور یسوع علیہ السلام کے بچپن کا واقعہ مختصراً بیان کرتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد پھر ایک طویل خاموشی ہے جو تقریباً اٹھارہ سال پر محیط ہے۔ ان اٹھارہ سالوں کے متعلق جو لکھا گیا ہے وہ سب قیاسی ہے۔

چاروں اناجیل اس طویل خاموشی کے بعد گویا ہوتی ہیں۔ اصطباغ مسیح کا واقعہ چاروں اناجیل نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

متی کے بیان کی مطابق جب مسیح اردن کے کنارے بپتسمہ کے لئے یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس آتا ہے تو دونوں میں گفتگو ہوتی ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ اس اعتبار سے وہ حضرت مسیح کے ماموں ہوئے۔ بائیبل کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰ علیہ السلام مسیح علیہ السلام سے صرف چھ ماہ پہلے پیدا ہوئے۔ قرآن کریم کے بیان سے بھی یہی اخذ ہوتا ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام مسیح کے پیش رو ہیں۔ بنی اسرائیل کو ان کا تعارف کراتے ہیں۔ متی لکھتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے مسیح میں تو تجھ سے بپتسمہ پانے کا محتاج ہوں مسیح جواب میں کہتا ہے کہ انبیاء کے صحیفوں کے

مطابق آپ نے مجھے اصطباغ (بپتسمہ) دینا ہے۔ لہٰذا اسے ہونے دے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت مسیح علیہ السلام کو بپتسمہ دیتے ہیں۔ اور جونہی آپ پانی سے باہر آتے ہیں تو ان پر روح القدس کبوتر کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔ متی کے بیان کے مطابق آسمان سے آواز آتی ہے کہ "یہ میرا بیٹا ہے المحبوب جس سے میں خوش ہوں"۔ (متی ب ۳:۱۷)

مرقس نے حضرت یحییٰ اور حضرت مسیح علیہما السلام کی باہمی گفتگو کو بیان نہیں کیا۔ صرف اصطباغ پانے، روح القدس کے نازل ہونے اور آسمانی آواز کے متعلق اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ (مرقس ۱:۹ تا ۱۱)

لوقا کا بیان مرقس سے "ملتا" ملتا ہے۔ آخری انجیل "انجیل یوحنا" کا انداز بیان بالکل مختلف ہے۔ یوحنا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰ علیہ السلام اردن کے کنارے کھڑے ہیں۔ چند لوگ بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ دور سے حضرت مسیح آتے دکھائی دیتے ہیں۔ اچانک یوحنا (یحییٰ) پکار اٹھتے ہیں۔ کہ لوگو! وہ دیکھو خدا کا برہ آتا ہے جس نے دنیا کے گناہ اٹھا لے جانے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس کی آمد کی میں ایک عرصہ سے بشارت دے رہا ہوں یہی وہ مسیح موعود ہے۔ اور اگرچہ میں اس سے پہلے نہیں ملا لیکن راستے میں آتے ہوئے میں نے اس پر روح القدس کو نازل ہوتے دیکھا ہے۔ لہٰذا یہ وہی ہے جو روح القدس سے اصطباغ دیتا ہے۔

تضاد بیانی

تین اناجیل (متی، مرقس اور لوقا) کے مطابق روح القدس اس وقت مسیح علیہ السلام پر نازل ہوا جب وہ پانی سے بپتسمہ پاکر باہر دعا کرتا تھا لیکن یوحنا کے بیان کے مطابق روح القدس راستے میں نازل ہوا۔ اس کے

بعد مسیح علیہ السلام اردن کے کنارے یحیٰ کے پاس پہنچے۔ پھر گفتگو ہوئی اور اس کے بعد اصطباغ ہوا۔

(یوحنا۱:۲۹تا ۳۴)

بیابان یہودیہ کی خلوت نشینی

جس طرح حضور ﷺ کو غار حرا میں خلوتوں میں پیغام حق کے لئے ایک عرصے تک تیار کیا گیا اس طرح سیدنا مسیح کو یہودہ کے بیابان میں چالیس دن اور چالیس رات تک رہنا پڑا۔ آپ علیہ السلام کو شیطان نے کئی آزمائشوں میں ڈالا لیکن ناکام رہا۔ پہلی آزمائش تو یہ تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام چالیس دن اور چالیس رات کے روزے سے سخت بھوک کر رہے تھے۔ شیطان نے ان کے پاس آکر کہا کہ اگر تو خدا کا بیٹا (برگزیدہ) ہے تو ان پتھروں کو کہہ کہ وہ روٹیوں میں تبدیل ہو جائیں۔ حضرت مسیح جواب دیتے ہیں کہ انسان کی زندگی ایک روٹی پر موقوف نہیں بلکہ انسان ایک کلمے (کن) سے زندہ رہتا ہے اور جب تک امر ربی نہ ہو موت واقع نہیں ہوتی۔ گویا مسیح علیہ السلام نے بتا دیا کہ میں اگرچہ انسان ہوں۔ پتھر روٹی میں تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن میں راضی برضائے الہی ہوں۔ مجھے قائم رکھنے والا اللہ ہے نہ کہ روٹی۔

دوسری آزمائش یہ تھی کہ شیطان مسیح علیہ السلام کو شہر میں لے گیا اور ہیکل کے کنگرے پر اسے کھڑا کر کے کہا اگر تو خدا کا بیٹا (برگزیدہ) ہے تو اپنے آپکو نیچے گرا دے۔ کیونکہ خدا نے تجھے محفوظ رکھنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس وعدے کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔ حضرت مسیح نے متیٰ ۶:۱۶ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ تورات میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ "تو خداوند

اپنے خدا کو مت آزما"

تیسری آزمائش یہ تھی کہ مسیح علیہ السلام کو ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی سے دنیا کی سب مملکتیں اور ان کی شان و شوکت دکھائی گئی۔ اور شیطان نے کہا کہ اگر تو مجھ کو سجدہ کرلے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ لیکن مسیح نے تورات کا حوالہ دیتے ہوئے جواب دیا اے شیطان دور ہو جا کیونکہ لکھا ہے کہ

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر"

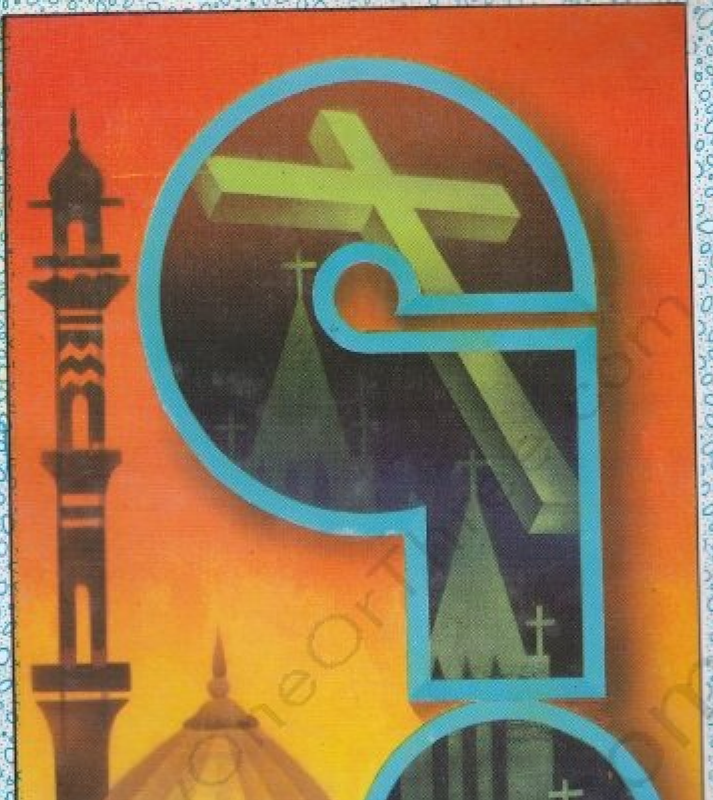
(استثنیٰ ۶: ۱۳)

مرقس نے واقعہ کو صرف دو آیتوں میں بیان کیا ہے۔ لوقا متی کے بیان کردہ واقعہ کو من و عن نقل کرتا ہے یوحنا نے اپنی انجیل میں اس واقعہ کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا۔

اعلان نبوت

چالیس دن کی خلوت کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یسوع مسیح علیہ السلام تبلیغ حق میں محو ہیں۔ آپ مختلف عبادت خانوں میں جاتے ہیں۔ لوگ آپ کی تعلیمات کو پورے انہماک سے سنتے ہیں۔ ان کی تعلیم فقیہوں اور فریسیوں کی تعلیم سے مختلف ہے۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص صاحب اختیار کی طرح تعلیم دیتا ہے یہ مبلغ رات دن محو سفر ہے تبلیغ کی خاطر آج یہاں تو کل وہاں کسی مشکل کو خاطر میں نہیں لاتا عوام الناس اس کی تعلیم سے کافی متاثر دکھائی دیتی ہے۔ اس کی زندگی میں پاکیزگی ہے۔ فریسیوں اور فقیہوں کی طرح یہ بے عمل اور ریاکار نہیں ہے۔ یہ شخص حق

پر پردوں کو ہٹاتا ہے۔ انسانی تعلیمات اور الہامی کتابوں کی نشاندہی کرتا ہے من گھڑت روایات کی مخالفت نے علماء شرع کو سیخ پا کر دیا ہے۔ وہ اسے جھوٹا۔ دغاباز، جادوگر کہتے ہیں۔ مسیح ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ تبلیغ حق کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ اپنے شہر کے لوگ مخالفت پر نکل اتر آتے ہیں آپ انھیں ایک حقیقت سے آگاہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں کوئی نبی بھی اپنے علاقے میں مقبول نہیں ہوتا لوگ اس کے خاندانی پس منظر، اس کی غربت کی وجہ سے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ آپ سلسلہ تبلیغ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن اب عبادت گاہوں میں نہیں بلکہ ویرانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ حاضر خدمت ہوتے ہیں تو فیض حاصل کرتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کو تائید خداوندی روح القدس کی صورت میں حاصل ہے۔ دشمن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپ علی الاعلان علماء شرع کو ان کے کردار پر ٹوکتے ہیں۔ یہ علماء حکومت وقت میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ آپ کے معجزات سے بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ وہ مسیح کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شاہ دین پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ مکابی تحریک کا بقیہ ہے۔ یہ یہودیوں کو رومی حکومت کے خلاف بغاوت پر ابھار رہا ہے۔ اپنے آپ کو یہودیوں کا بادشاہ کہتا ہے مسیح کو پکڑنے کی کوشش کی جاتی ہے مسیح کے ایک منافق شاگرد یہودہ کو رشوت دی جاتی ہے۔ وہ مسیح کو پکڑوا دیتا ہے۔ کون پکڑا گیا؟ کیسے صلیب دی گئی؟ ایک مختلف مسئلہ ہے اس کا تصفیہ بعد میں کیا جائے گا۔ ایک شخص صلیب دیا جاتا ہے اور یہودی اور رومی حکومت اپنے تئیں مطمئن ہو جاتے ہیں۔



مسیح خدا نہیں

مُصنّف

حجۃ الاسلام اِمام مُحمّد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

معجزات مسیح

اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو کئی معجزات سے نوازا ہے۔ قرآن کریم نے ان معجزات کو بینات کا نام دیا ہے سورہ بقرہ میں ارشاد ہے۔ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ○

(بقرہ ۲۵۳)

"اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے"

بائبل اور قرآن کریم نے آپ کے کئی معجزات کو بیان کیا ہے۔ ذیل میں ان معجزات کو بیان کیا جاتا ہے۔

معجزانہ پیدائش

اس ضمن میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ کچھ لوگوں نے تو اس معجزہ کا انکار کیا ہے جن میں ڈاکٹر ڈیوڈ سن جو عبرانی کا مشہور عالم ہے اور بائیبل کا سرکردہ مفسر مانا جاتا ہے سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ریوس جو اسے استہزائیہ انداز میں لیتا ہے اور اسے توہم پرستی کے مترادف قرار دیتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بلکا یسوع کے لفظ کے تحت اس معجزہ کے وقوع کا انکار کرتا ہے اور لکھتا ہے "کچھ شک نہیں کہ باکرہ سے پیدا ہونے کا یہ قصہ ہم کو کفار کے خیالات کے دائرہ میں داخل کر دیتا ہے"

اسی طرح ملک پاکستان میں کئی نام نہاد مفسرین نے بھی اس معجزہ کو ماننے انکار کیا ہے۔ اور قرآن کریم کی آیات کی معنوی تحریف کی جرأت کی ہے۔ ان فضلاء میں سرسید کا نام سرفہرست ہے۔ معجزات عیسوی کو بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ کی حقیقت پر کچھ لکھا جائے۔

مسیحی علماء عموماً اس کو دو تفسیریں کرتے ہیں۔ پہلی تعریف تو یہ ہے کہ "معجزہ قوانین طبیعت کی خلاف ورزی یا طبیعت کے جاری و منظم قوانین میں وقفہ اور خلل پڑ جاتا ہے۔ یعنی کوئی فوق الطبیعت سے زور آور ہوتا ہے مداخلت کرتا ہے اور قوانین طبیعت کے خلاف عمل کرتا ہے یا عارضی طور پر ان کی فاعلیت کو معلق و معوق کر دیتا ہے جس کا نتیجہ معجزہ ہوتا ہے۔

What is Miracle By Prof Levonian.

(ترجمہ: معجزہ کیا ہے؟ مسٹر۔ ایف۔ ڈی وارث۔ پنجاب ریلیجس

یک سوسائٹی)

پروفیسر مذکورہ نے اس لفظ کی ایک اور تشریح نقل کی ہے جو قدرے زیادہ جامع ہے۔ "معجزات کو طبیعت کے عالی تر قوانین سے منسوب کیا جاتا ہے جو انسان کے دائرہ عقل سے خارج ہیں۔ قوانین طبیعت کے متعلق ہمارا علم ناقص ہے لیکن خدا عالم مطلق ہے اور سب باتوں سے آگاہ ہے وہ ان عالی تر قوانین سے بخوبی واقف ہے جن کا ہنوز ہم کو علم نہیں اور ان قوانین کے مطابق عمل کر کے وہ معجزات کر سکتا ہے۔"

(ایضاً صفحہ ۵)

پہلی تعریف کی نسبت معجزہ کی یہ دوسری تعریف زیادہ قابل قبول ہے۔

علماء اسلام نے بھی معجزہ کی قریباً یہی تفسیر کی ہے۔ حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری کی تفسیر ضیاء القرآن سے معجزہ کی تفسیر نقل کی جاتی ہے "ان لوگوں کا دعوی یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام اس میں یہ بے عدیل ارتباط اور موزونیت بے مثل ترتیب اور یکسانیت اس امر پر شاھد عادل ہے کہ یہ نظام چند قوانین اور ضوابط کے مطابق عمل پیرا ہے۔ جنہیں قوانین فطرت (Laws of nature) کہا جاتا ہے اور فطرت کے قانون اٹل ہیں۔ ان میں ردوبدل ممکن نہیں۔ ورنہ کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس لئے عقل معجزات کو تسلیم نہیں کرتی۔"

اس کے متعلق گزارش ہے کہ علماء اسلام نے معجزہ کی جو تعریف کی ہے وہ یہ نہیں کہ معجزہ وہ ہوتا ہے جو قوانین فطرت کے خلاف ہو اور نوامیس قدرت سے برسرپیکار ہو بلکہ معجزہ کی تعریف یہ ہے کہ

اِدَّعٰی اَنَّہٗ رَسُولُ اللّٰہِ یَعْنِیْ مَدَّعِیْ " رسالت کی سچائی ثابت کرنے کے لئے کسی ایسے امر کا ظہور ہونا جو عادت کے خلاف ہو اسے معجزہ کہتے ہیں........ ہو سکتا ہے کہ معجزات قانون فطرت کے مطابق ہی رو پذیر ہوئے ہوں۔ لیکن ابھی تک وہ قانون فطرت ہمارے ادراک کی سرحد سے ماورا ہو۔ یہ دعوی کرنا کہ فطرت کے تمام قوانین بے نقاب ہو چکے ہیں۔ اور ذہن انسانی نے انکا احاطہ کر لیا ہے؟ انتہائی مضحکہ خیز اور غیر معقول ہے۔ آج تک کسی فلسفی یا سائنس دان نے اس کا دعوی نہیں کیا۔

نیز قوانین فطرت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ اٹل اور غیر متغیر ہیں۔ یہ بھی ناقابل تسلیم ہے۔ یہ خیال تب ہی قابل تسلیم ہوتا جب ان قوانین کو ہر قسم کے نقص اور عیب سے مبرا سمجھ لیا جائے۔ اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ اختیار کیا جائے کہ اس کائنات کی آرائش و زیبائش کے لئے یہی قوانین کفایت کرتے ہیں۔ لیکن اہل خرد کے نزدیک یہ خیال محل نظر ہے چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے معجزہ (MIRACLE) پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

It is an unwarranted idealism and optimisn which finds the course of nature so wise good that any change in it must be regardedand so as incredible.

Ency. Bri- V.15 P586

یعنی یہ ایک غیر معقول تصور اور خوش فہمی ہے۔ جو یہ خیال کرتی

ہے کہ فطرت کا طریق کار اتنا دانش مندانہ اور بہترین ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی جائز نہیں۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے وجود کو مانتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ منکر ہیں تو آپ سے معجزات کے متعلق بحث عبث اور قبل از وقت ہے۔ پہلے آپ کو وجود خداوندی کا قائل کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد معجزہ کے اثبات کا مناسب وقت آئے گا۔ اور اگر آپ وجود خداوندی کے قائل تو ہیں لیکن آپ کا تصور یہ ہے کہ خدا اور فطرت (Nature) ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یا آپ خدا کو خالق کائنات تو مانتے ہیں۔ لیکن یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس کا اب پیدا کردہ دنیا میں کوئی عمل دخل نہیں۔ اور وہ اس میں کسی قسم کا تصرف نہیں کر سکتا۔ بلکہ الگ تھلگ بیٹھ کر کسی بے بس تماشائی کی طرح کائنات کے ہنگامہ ہائے خیر و شر کو خاموشی سے دیکھ رہا ہے۔ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ تو پھر معجزہ کے انکار کی وجہ سمجھ آسکتی ہے۔ لیکن اگر آپ ذات خداوندی کے قائل ہیں۔ اور اسے خالق ماننے کے ساتھ ساتھ قادر مطلق اور مدبر بااختیار بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ایمان رکھتے ہیں۔ کہ کوئی پتہ اس کے اذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ تو پھر آپ کا نوامیس فطرت کو غیر متغیر

یقین کرنا اور اس بناء پر معجزات کا انکار کرنا ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عام معمول یہ ہے کہ وہ علت و معلول اور سبب و مسبب کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے۔ اور ظہور معجزہ کے وقت اس نے اپنی قدرت اور حکمت کے پیش نظر خلاف معمول اس تسلسل کو نظر انداز کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ ایک بااختیار ہستی ہے۔ وہ جب چاہے اپنے معمول کو بدل لے۔ ایک شخص کی سال ہا سال کی عادت

یہ ہے وہ رات کو دس بجے روزانہ سوتا ہے اور صبح چار بجے بیدار ہوتا ہے۔ اگر کسی روز آپ اسے ساری رات جاگتے ہوئے دیکھیں تو آپ اس مشاہدہ کا انکار نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ آج خلاف معمول فلاں صاحب رات بھر جاگتے رہے۔ اسی طرح ان قوانین فطرت کو عادت خداوندی اور معمول ربانی سمجھنا چاہئے۔ اور کسی چیز کا خلاف معمول وقوع پذیر ہونا قطعاً اس کے ناممکن ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

The laws of nature may be regarded ashabits of the divine activity and miraclesas unusual acts which while consistent with divine character, works a new stage in the fulfilment of the purpose of God.

ENCY - BRI - V.15 P. 586

یعنی فطرت کو ہم عادت خداوندی کہہ سکتے ہیں۔ معجزات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت کے پیش نظر خلاف عادت ایسا کیا ہے اور یہ قطعاً ناروا نہیں۔

مغربی فلاسفروں میں سے ہیوم (David Hume) نے معجزات پر بحث کی ہے اور بری شدومد سے اس کا انکار کیا ہے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے جو طریقہ اس نے اختیار کیا ہے وہ توجہ طلب ہے وہ کہتا ہے کہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ عالم ایک مخصوص نہج اور متعین انداز

کے مطابق چل رہا ہے۔ اور معجزات ہمارے مشاہدے کے خلاف رو پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر معجزہ کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس جو دلائل ہیں۔ وہ تجربہ و مشاہدہ کے دلائل و براہین سے جب تک زیادہ قوی اور مضبوط نہ ہوں۔ اس وقت تک ہم معجزہ کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ثبوت معجزہ کے لئے ایسے وزنی دلائل موجود نہیں اس لئے عقلاً معجزہ کا امکان تسلیم کرنے کے باوجود ہم ان کے وقوع کو تسلیم نہیں کر سکتے۔
انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار ہیوم کے اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہم یہ قاعدہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ معجزات تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہوتے ہیں۔ کیونکہ تجربات سے تمہاری مراد کیا ہے کیا تم یہ کہتے ہو کہ معجزہ تمہارے تجربات کے خلاف ہوتا ہے اور آپ کا یہ قاعدہ کلیہ محتاج دلیل ہے پہلے آپ تو یہ ثابت کریں کہ آپ نے تمام تجربات کا احاطہ کر لیا ہے۔ پھر آپ کو یہ ثابت کرنا ہو گا کہ یہ معجزہ ان تمام تجربات کے خلاف ہے۔ جب آپ اپنی دلیل کی کلیت ثابت نہیں کر سکتے اس وقت تک آپ کی دلیل قابل قبول نہیں۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ تجربات سے مراد تجربات عامہ ہیں۔ یعنی معجزہ تجربات عامہ کے خلاف ہے تو پھر اس سے تو فقط اتنا ہی ثابت ہوا کہ معجزہ عام تجربات اور معمولات کے خلاف ہے۔ تمام تجربات و مشاہدات کے خلاف ہونا تو لازم نہ آیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ معجزہ کسی تجربہ کے مطابق ہو۔ لیکن وہ تجربہ آپ کی فہم رسائی سے بھی بلند ہو۔

This Phrase itstlf (that Miracle is Contrary to experience) is as poley Pointed out ambiguou.

If it means all experience it assumes The point to be proved' if itmeans only common experience then it simply asserts that the Miracle is unusal Atruism of miracle.

Ency - Bri v.15 p.586

استاذ احمد امین مصری ہیوم کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہیوم نے اپنے ایک مقالہ میں معجزات پر بحث کی ہے اور بڑی کوشش سے ان کا بطلان ثابت کیا ہے۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ کیونکہ معجزات ہمارے تجربہ کے خلاف ہیں اس لئے ناقابل تسلیم ہیں۔ استاذ موصوف لکھتے ہیں کہ ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم ہیوم سے پوچھیں کہ ایک طرف تو ہمارا یہ دعویٰ کہ علت و معلول اور سبب و مسبوب کا حقیقت امر سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ہم بارہا مشاہدہ کرتے آئے ہیں کہ ایسا ہو تو یوں ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے ایک چیز کو دوسری چیز کی علت فرض کر لیا حالانکہ حقیقت میں اس کا علت ہونا ضروری نہیں۔ اور دوسری طرف تم معجزہ کا انکار اس اساس پر کرتے ہو کہ یہ مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف ہے جب تمہارے نزدیک علت اور معلولیت کا کوئی قانون ہی نہیں۔ ہر چیز بغیر تحقیق علت وقوع پذیر ہو رہی اور کسی چیز کے ساتھ ربط نہیں تو پھر اگر معجزہ کا وقوع ہوا جس کی ہم تعلیل کرنے سے قاصر ہیں تو کون سی قباحت ہو گئی۔ پہلے بھی جتنی چیزیں معرض وجود میں آئیں وہ علت حقیقیہ کے بغیر موجود تھیں اور یہ امر بھی بغیر علت کے ظاہر ہوا پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ تم ایک تو تسلیم

کرتے ہو اور دوسرے کے انکار میں تم اتنا غلو کرتے ہو کہ تمہیں اپنے فلسفہ کی بنیاد بھی سرے سے فراموش ہو گئی ہے۔

(قصہ الفلسفہ الحدیثہ جز اول ص ۲۴۵)

قبلہ پیر صاحب کی اس تحقیق کے بعد معجزہ کا انکار محض ہٹ دھری محسوس ہوتا ہے اگر انسان خدا تعالیٰ کو عاجز سمجھ لے تو معجزہ کے وقوع کا انکار کر سکتا ہے۔ اگر وہ قادر مطلق ہے جس نے پوری کائنات کو کلمہ کن سے تخلیق فرما دیا ہے تو اب وہ اگر کسی قانون کو توڑ دے یا کسی مافوق الفطرت قانون کے ذریعے کسی واقعہ کو صادر کر دے تو کوئی بعید نہیں۔ بلکہ کائنات کا وجود بذاتہ ایک معجزہ ہے

اہل کتاب معجزہ کے وقوع کے قائل ہیں اسی لئے بائیبل میں کثرت سے معجزات کا تذکرہ ملتا ہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کئی معجزات دکھائے۔ پیدائش کے سلسلے میں کئی معجزات کو تفصیل سے بیان کیا گیا۔ اعلان نبوت کے بعد آپ علیہ السلام سے کئی معجزات صادر ہوئے۔ بعض کو قرآن کریم اور بائیبل نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے اور بعض میں قرآن منفرد ہے اور بعض معجزات صرف بائیبل میں مذکور ہیں۔ اہل اسلام بائیبل کی ان تعلیمات کو رد نہیں کرتے جن کے بارے میں قرآن خاموش ہے اور ان کی تصدیق بھی نہیں کرتے۔ اگر ذرا سا اشارہ بھی مل جائے تو اہل اسلام تصدیق کر لیتے ہیں لیکن جن تعلیمات کا قرآن نے رد کیا ہے انہیں ہم الہامی تعلیمات اور تحریف کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔ ذیل میں مسیح علیہ السلام کے مزید معجزات دیئے جاتے ہیں

تخلیق طیور:۔

اناجیل اربعہ تخلیق طیور کے معجزہ کو بیان نہیں کرتیں۔ لیکن اپو کریفا (جعلی کتابیں) جنہیں کلیسا نے ممنوع قرار دیا ہے ان میں یہ معجزہ مذکور ہے۔

قرآن کریم نے اس معجزہ کو دو مقامات پر بیان کیا ہے ایک سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ گفتگو میں اور دوسرے سورۃ مائدہ کے بیان میں جب اللہ تعالیٰ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی نوازشات اور انعامات جتلائے گا۔ اور ان سے پوچھے گا۔ کہ کیا تم نے انہیں اپنی عبادت کی تعلیم دی تھی......

سورۃ آل عمران کے الفاظ یہ ہیں

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـٴَـةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ

(آل عمران ۴۹)

"میں بنا دیتا ہوں تمہارے لئے کیچڑ سے پرندے کی سی صورت پھر پھونکتا ہوں اس (بے جان صورت) میں تو وہ فورا" ہو جاتی ہے پرندہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے"

سورۃ مائدہ میں صرف صیغے کا فرق ہے۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـٴَـةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِیْ

(مائدہ ۱۱۰)

اعتراض

خلقت کی نسبت صرف اس ذات کی طرف ہو سکتی ہے جو مستقل بالذات ہو جو تخلیق میں کسی دوسرے کا محتاج ہو وہ زندگی کیسے دے سکتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسیح علیہ السلام قدیم الٰہی ذات ہیں اسی لئے یوحنا نے اپنی انجیل میں کہا ہے "اسی سے سب کچھ پیدا ہوا ایک بھی چیز جو پیدا ہوئی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔"

(یوحنا 3.2:1)

تحقیقی جواب

علامہ شبیر احمد عثمانی کی تفسیر سے یہ اشکال دور ہو جاتا ہے آپ لکھتے ہیں "محض شکل و صورت بنانے کو "خلق" سے تعبیر کرنا صرف ظاہری حیثیت سے ہے جیسے حدیث صحیح میں معمولی تصویر بنانے کو خلق سے تعبیر فرمایا

اِحْیُوْا مَا خَلَقْتُمْ یا خدا کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ فرما کر بتلا دیا کہ ظاہری صورت کے لحاظ سے غیر اللہ پر بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے اگر چہ حقیقت تخلیق کے لحاظ سے حق تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں کہلا سکتا شاید اسی لئے یہاں یوں نہ فرمایا اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ طَیْرًا "میں مٹی سے پرندہ بنا دیتا ہوں" بلکہ یوں کہا کہ میں مٹی سے پرندہ کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارتا ہوں پھر وہ پرندہ اللہ کے حکم سے بن جاتا ہے

(آل عمران ۴۹ فائدہ نمبر ۵)

الزامی جواب

ایک شخص بندوق کا فائر کر کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا ہے تو کیا کسی مذہب پر یقین رکھنے والا شخص اس فعل کی وجہ سے قاتل کو موت کا مالک کہہ سکتا ہے۔یقیناً نہیں بلکہ وہ محض فعل قتل کا ارتکاب کرنے والا ہے اور موت دینے والا صرف اللہ ہے نہ کہ وہ شخص اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ ظاہری صورت بناتے اور پھونک مارتے لیکن اسے زندگی عطا کرنے والی اللہ کی ذات ہوتی حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں عقیدہ الوہیت کے بطلان کے لئے انشاء اللہ بعد میں تفصیلی گفتگو ہو گی۔

4۔ جنم کے اندھوں کو بینا کرنا قرآن کریم اور اناجیل اربعہ نے اس معجزہ کو بیان کیا ہے قرآن کریم صرف اشارہ کرتا ہے اور کوئی واقعہ بیان نہیں کرتا وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ "اور میں تندرست کر دیتا ہوں مادر زاد اندھے کو۔

(آل عمران ۴۹)

اناجیل اربعہ نے کئی واقعات بیان کئے ہیں

ا۔ متی بیان کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام اپنے حواریوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ دو مادر زاد اندھے پکارتے ہوئے مسیح علیہ السلام کے پیچھے ہو لئے اور عرض کرنے لگے کہ وہ انہیں شفاء دیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں یقین ہے کہ میں تمہیں بینائی دے سکتا ہوں انہوں نے اپنے یقین کا اظہار کیا حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھا اور ارشاد فرمایا "کہ تمہارے ایمان کے موافق تمہارے لئے ہو وہ دونوں

شخص فوراً بینا ہو گئے"

(متی ب۹: ۲۷ تا ۳۱)

۲۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ متی نے (باب ۲۰: ۲۹ تا ۳۴) "یریحو کے نابینا" کے عنوان سے بیان کیا ہے متی لکھتا ہے کہ "جب وہ یریحو سے نکل رہے تھے تو ایک بڑا ہجوم اس کے پیچھے ہو لیا۔ اور دیکھو دو اندھوں نے جو راہ کے کنارے بیٹھے تھے یہ سن کر کہ یسوع جا رہا ہے چلا کر کہا اے خداوند داؤد کے بیٹے ہم پر رحم کر اور لوگوں نے انہیں جھڑکا کہ چپ رہیں لیکن وہ اور بھی چلا کر بولے کہ اب خداوند داؤد کے بیٹے ہم پر رحم کر۔ اور یسوع کھڑا ہو گیا اور انہیں بلا کر کہا تم کیا چاہتے ہو کہ میں تمہارے لئے کیا کروں۔ انہوں نے اس سے کہا کہ اے خداوند یہ کہ ہماری آنکھیں کھل جائیں۔ یسوع نے ترس کھا کر ان کی آنکھوں کو چھوا اور وہ فوراً بینا ہو گئے۔

۳۔ مرقس اپنی انجیل میں اسی واقعہ کو بالکل اسی انداز میں "یریحو کا نابینا" کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔ دیکھئے

(مرقس ب۱۰: ۴۶ تا ۵۲)

تضاد

متی کا واقعہ آپ نے تفصیلاً ملاحظہ فرمایا اس میں دو نابینا ہیں جنہیں حضرت مسیح علیہ السلام نے بینائی عطا کی۔ مرقس میں یریحو کے واقعہ میں دو نابینے نہیں بلکہ ایک ہے۔ یقیناً یا تو وہ ایک ہو گا یا دو ہوں گے۔ یہ کھلا تضاد ہے ہم انہیں دو الگ الگ واقعات پر بھی محمول نہیں کر سکتے کیونکہ انداز ایک ہی ہے۔ صرف تعداد میں فرق ہے۔ الگ واقعہ ہوتا تو

کہیں تو بیان میں فرق آتا۔

۴۔ لوقا کے نزدیک بھی ریحو کا نابینا شخص جسے مسیح علیہ السلام نے شفا دی ایک ہے۔

لوقا اور مرقس کا باہمی تضاد

مرقس کے بیان کے مطابق یسوع علیہ السلام جب ریحو سے نکل رہے تھے تو یہ واقعہ پیش آیا ملاحظہ کیجئے۔

"پھر ریحو میں آئے اور جب وہ اپنے شاگردوں اور بڑے ہجوم سمیت ریحو سے نکلتا ہے......."

(ب ۱۰: ۴۶......)

جبکہ لوقا کے نزدیک یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب مسیح علیہ السلام ریحو کی طرف آرہے تھے اور ابھی داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔

"پھر ایسا ہوا کہ جب وہ ریحو کے نزدیک آیا........"

(لوقا ۱۸: ۳۵.....)

۵۔ مرقس بیت صیدا کے نابینے کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام جب بیت صیدا میں تشریف لائے تو آپ کی خدمت میں ایک اندھے کو لایا گیا۔ اس نے آپ کی منت کی۔ آپ کو اس پر ترس آگیا۔ آپ نے اسے ساتھ لیا اور شہر سے باہر چلے گئے۔ اس کی آنکھوں پر تھوکا اور مس کیا تو بینا ہو گیا اور آپ نے اسے رخصت کر دیا اور تاکید کی کہ کسی سے یہ معجزہ بیان نہ کرنا۔

(باب ۸: ۲۲)

۶۔ یوحنا نے اسی نوعیت کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اسے نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس واقعہ کے الفاظ مسیح علیہ السلام کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یوحنا لکھتا ہے "اور اس نے گزرتے ہوئے ایک شخص کو دیکھا جو پیدائشی اندھا تھا اور اس کے شاگردوں نے اس سے پوچھا۔ ربی کس نے گناہ کیا تھا۔ اس نے یا اس کے ماں باپ نے کہ یہ اندھا پیدا ہوا۔ یسوع نے جواب دیا نہ تو اس نے گناہ کیا تھا نہ اس کے ماں باپ نے۔ لیکن یہ اس لئے ہوا کہ خدا کے کام اس میں ظاہر ہوں۔ واجب ہے کہ میں جب تک دن ہے اس کا کام کروں جس نے مجھے بھیجا ہے۔ وہ رات آنے والی ہے جس میں کوئی شخص کام نہیں کر سکتا۔ جب تک میں دنیا میں ہوں دنیا کا نور ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے زمین پر تھوکا اور تھوک سے مٹی گوندھی اور وہ مٹی اس اندھے کی آنکھوں پر لگائی۔ اور اس سے کہا جا سلوام (مترجم بھیجا ہوا) کے تالاب میں دھو۔ پس وہ گیا اور دھویا اور بینا ہو کر لوٹا۔

(یوحنا ۹ باب مکمل دیکھیں)

اعتراض

مسیح علیہ السلام کے دور میں علم طب عروج پر تھا۔ آپ ایک ماہر طبیب تھے۔ اپنی طبابت کی بناء پر مادر زاد اندھوں کا علاج کرتے تھے۔ آپ کے عقیدت مندوں نے مبالغہ آمیزی سے کام لیا اور اسے معجزہ بنا ڈالا۔

جواب:۔

جنم کے اندھے کا علاج قدیم طب کے کسی دور میں ممکن نہیں رہ

موجودہ دور میں بھی یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہوتا۔ مسیح علیہ السلام چلتے پھرتے آپریشن کر لیتے اور کمال مہارت پر شفاء دیتے یہ تو اور زیادہ حیرت انگیز معجزہ ہے۔ دوسرے ان واقعات کو جھٹلانے اور اسے مہارت مسیح پر محمول کرنے کی دلیل کیا ہے؟ بغیر دلیل کے اعتراض محض ظن و تخمین ہے۔ اس لئے وحی خداوندی کے روشن حقائق کو ایک انسان کے گمان پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔

شفائے مبروص

قرآن کریم نے اس معجزہ کی تصدیق کی ہے ارشاد خداوندی ہے وَ اُبْرِئُ......وَالْاَبْرَصَ "اور میں تندرست کر دیتا ہوں (لا علاج) کوڑھی کو۔

(آل عمران ۴۹)

اناجیل اربعہ نے اس ضمن میں کئی واقعات بیان کئے ہیں۔

۱۔ متی بیان کرتا ہے کہ "جب وہ پہاڑ سے اترا تو ایک بڑا ہجوم اس کے پیچھے ہو لیا۔ اور دیکھو ایک کوڑھی نے آکر اسے سجدہ کیا اور کہا۔ اے خداوند اگر تو چاہے تو مجھے پاک صاف کر سکتا ہے۔ تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا اور کہا میں چاہتا ہوں تو پاک صاف ہو جا۔ فوراً" اس کا کوڑھ جاتا رہا۔

(متی ۸:۱تا۴)

۲۔ مرقس نے اسی واقعہ کو باب اول میں لکھا ہے۔ وہ صرف اتنا اضافہ کرتا ہے کہ یسوع کے منع کرنے کے باوجود وہ شخص اس معجزے کی تشہیر کرنے لگا اور اس وجہ سے مسیح علیہ السلام پھر کسی شہر میں جا کر تبلیغ نہ

کر سکے بلکہ ویرانوں میں لوگ آپ کے پاس آتے رہے۔

۳۔ اس واقعہ کو لوقا نے پانچویں باب میں بیان کیا ہے۔ لوقا اور مرقس کے الفاظ ایک ہیں۔

۴۔ باب سترہ میں لوقا دس کوڑھیوں کی شفا دہی کا واقعہ بیان کرتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ مسیح یروشلم کو سامریہ اور جلیل کے درمیانی راستے سے جا رہا تھا۔ ایک گاؤں کے نزدیک اسے دس کوڑھی ملے جن میں سے ایک سامری تھا کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر انہوں نے شفاء طلب کی۔ آپ نے فرمایا "جاؤ اپنے آپ کو کاہنوں کو دکھاؤ وہ جاتے جاتے صحت یاب ہو گئے۔"

مردوں کو زندہ کرنا

قرآن کریم نے آپ علیہ السلام کے اس معجزہ کی بھی تصدیق کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ○

(آل عمران ۴۹)

"اور میں زندہ کر دیتا ہوں مردوں کو اللہ کے اذن سے"

اناجیل نے اس ضمن میں چند واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۱۔ متی یائر کی بیٹی کے واقعہ کو قلم بند کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ایک سردار نے آکر اسے سجدہ کیا اور کہا۔ میری بیٹی ابھی مری ہے لیکن تو چل کر اپنا ہاتھ اس پر رکھ تو وہ زندہ ہو جائے گی۔ اور یسوع اٹھ کر اپنے شاگردوں کے ساتھ اس کے پیچھے چلا....... اور جب یسوع اس سردار کے گھر پہنچا۔ اور بانسلی بجانے والوں اور بھیڑ کو دھوم مچاتے دیکھا تو کہا ہٹ جاؤ کیونکہ لڑکی مری نہیں بلکہ سوئی ہے۔ تو وہ اس پر ہنسنے لگے اور جب بھیڑ

نکال دی گئی تو اس نے اندر جا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور لڑکی اٹھی اور اس کی شہرت تمام علاقے میں پھیل گئی۔"

(متی ۹:۱۸ تا ۲۶)

مرقس نے اسی واقعہ کو پانچویں باب میں قدرے زیادہ تفصیل اور اختلاف سے بیان کیا ہے۔

تضاد

متی کے نزدیک یائر نے یسوع کو خبر دی کہ میری بیٹی مر گئی ہے۔ جبکہ مرقس بیان کرتا ہے کہ یائر نے کہا کہ میری بیٹی مری نہیں لیکن مرنے کے قریب ہے مرقس کے الفاظ ملاحظہ ہوں "عبادت خانے کے سرداروں میں سے یائیر نامی ایک آیا اور اسے دیکھ کر اس کے قدموں پر گرا اور یوں کہتے ہوئے منت کرنے لگا کہ میری چھوٹی بیٹی مرنے کے قریب ہے۔

لوقا نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے اس کی تفصیلات مرقس سے ملتی جلتی ہیں۔

یوحنا نے یائیر کی بیٹی کے واقعہ کو بیان نہیں کیا۔

۲۔ لوقا نے نائین کے ایک نوجوان کا واقعہ بیان کیا ہے جو ایک بیوہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب آپ شہر کے پھاٹک پر پہنچے تو اس نوجوان کا جنازہ جا رہا تھا۔ آپ کو جب معلوم ہوا کہ یہ ایک بوڑھی بیوہ کا اکلوتا بیٹا ہے تو آپ کو ترس گیا آپ نے جنازہ رکھنے کا حکم دیا۔ آپ نے اس کی ماں کو تسلی دی اور جوان سے فرمایا۔

"اے نوجوان میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ اور وہ مردہ اٹھ بیٹھا اور بولنے لگا"۔ (لوگ یہ دیکھ کر) خدا کی تمجید کرنے لگے اور کہنے

لگے۔ "ایک بڑا نبی ہم میں برپا ہوا ہے اور یہ کہ خدا نے اپنی امت پر نظر کی ہے "۔(لوقا ۷:۱۱ تا ۱۷)

۳۔ یوحنا نے لعزر کا مشہور واقعہ بیان کیا ہے۔ اس واقعہ کو بعض مسلم مفسرین نے بھی بیان کیا ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے۔

لعزر حضرت مسیح علیہ السلام کی عقیدت مند عورت مریم اور اس کی بہن مارتھا کا بھائی تھا۔ حضرت یسوع کو اس کی بیماری کی خبر دی گئی۔ لیکن آپ دور ہونے کی وجہ سے جب پہنچے تو اسے قبر میں رکھے چار دن ہو چکے تھے۔ آپ نے مریم اور مارتھا دونوں بہنوں کو تسلی دی۔ آپ قبر پر تشریف لے گئے۔ قبر کا پتھر ہٹایا گیا۔ مسیح علیہ السلام نے "اپنی آنکھیں اٹھا کر کہا اے باپ میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تو نے میری سن لی ہے۔ اور مجھے تو معلوم تھا کہ تو ہمیشہ میری سنتا ہے مگر ان لوگوں کے سبب سے جو آس پاس کھڑے ہیں۔ میں نے یہ کہا ہے تاکہ وہ ایمان لائیں کہ تو ہی نے مجھے بھیجا ہے۔ اور یہ کہہ کر اس نے بلند آواز سے پکارا کہ اے لعزر نکل آ۔ جو مر گیا تھا وہ کفن سے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے نکل آیا اور اس کا چہرہ رومال سے لپٹا ہوا تھا۔

(یوحنا ۱۱:۱ تا ۴۴)

یوحنا کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یسوع علیہ السلام کے معجزات ان کی نبوت کی دلیل تھے۔ نہ کہ ان کی الوہیت کا نشان۔

غیب کی خبریں دینا

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرما دیا تھا۔

جیسا کہ نبوت کا تقاضا ہے آپ کی نگاہ پاک ماضی حال اور مستقبل کے پردوں میں چھپے حالات و واقعات کا مشاہدہ کر سکتی تھی۔ قرآن کریم مسیح علیہ السلام کی زبانی اس معجزہ کو یوں بیان کرتا ہے۔

اور بتلاتا ہوں تمہیں جو کچھ تم کھاتے اور جو کچھ جمع کر کے رکھتے ہو گھروں میں۔

انجیل میں ایسے کئی واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔ ان میں سے چند واقعات بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

ا۔ مگر آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں مجالس کے حوالے کریں گے اور تم میری خاطر حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے تاکہ ان کے اور غیر قوموں کے لئے گواہی ہو۔ لیکن جب وہ تمہیں پکڑوائیں تو فکر نہ کرو کہ ہم کس طرح کہیں اور کیا کہیں کیونکہ جو کچھ تمہیں کہنا ہو گا۔ سو اسی گھڑی تمہیں بتایا جائے گا کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کا روح تم میں بولنے والا ہو گا۔ بھائی کو بھائی اور بچے کو باپ قتل کے لئے حوالے کرے گا اور بچے ماں باپ کی مخالفت میں اٹھیں گے اور انہیں مروا ڈالیں گے اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے کینہ رکھیں گے مگر جو آخر تک ثابت قدم رہے گا وہی نجات پائے گا۔

(متی ۱۰: ۱۷ تا ۲۲)

متی نے مسیح علیہ السلام کے غیب پر مطلع ہونے کی ایک اور تصریح ان الفاظ میں کی ہے۔

"اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی۔ اور ایک ایسی قوم کو دے دی جائے گی جو اس کے پھل ادا کرے اور جو اس پتھر پر گرے گا۔ وہ چور ہو جائے گا اور جس پر وہ گرے

اسے پیس ڈالے گا"

(متی ۲۱: ۴۳ تا ۴۴)

اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام خدا کی بادشاہی کے بنی اسماعیل کی طرف منتقل ہو جانے کی خبر دے رہے ہیں۔ جو آپ کے رفع آسمانی کے تقریباً پانچ صدی بعد وقوع پذیر ہوئی۔ خدا کی بادشاہی سے ظاہری سلطنت مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ مسیح علیہ السلام کے دور ہمایوں میں بنی اسرائیل روم کے ماتحت تھے آپ نے نہ صرف نبی آخرالزمان کی بعثت کی خبر دی بلکہ اسلامی سلطنت کی سطوت و صولت کا نقشہ کھینچ دیا آپ نے بتا دیا کہ نبوت کی بنی اسرائیل قدر نہیں کریں گے یعنی تحریف کی صورت میں بے قدری کا ارتکاب کریں گے۔ اور بنی اسماعیل اس نعمت تمام کی پاسداری کا حق ادا کر دیں گے۔

اناجیل اربعہ میں محض معجزات ایسے ہیں جنہیں قرآن کریم نے بیان نہیں کیا۔ اہل اسلام ان معجزات کو ہرگز رد نہیں کرتے اس لئے کہ قرآن کریم نے تصریح کر دی ہے کہ یسوع علیہ السلام کو بینات عطا ہوئے ہیں۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ چند معجزات کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

شفائے مفلوج

متی نے نویں باب میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے حضرت مسیح علیہ السلام کی خدمت میں ایک فالج زدہ شخص لایا گیا۔ آپ نے اسے حکم دیا کہ اٹھ اور اپنی چارپائی اٹھا۔ اس سے پہلے وہ حرکت تک نہیں کر سکتا تھا لیکن مسیح علیہ السلام کے کہنے کی دیر تھی کہ یہ بیمار تندرست ہو گیا اور گھر چلا گیا۔

اسی واقعہ کو مرقس نے اپنی انجیل کے دوسرے باب میں بیان کیا ہے۔ مرقس کے بیان میں اس قدر زیادہ الفاظ ہیں کہ "ہجوم کی کثرت کی وجہ سے وہ دروازے سے اندر داخل نہ ہو سکے تو انہوں نے مکان کی چھت کھول کر مریض کی چارپائی لٹکا دی۔"

لوقا نے اس واقعہ کو مرقس کے انداز میں تحریر کیا ہے یوحنا نے اس معجزہ کو بیان نہیں کیا ہے۔

تسکین طوفان

متی نے آٹھویں باب میں تسکین طوفان کا واقعہ بیان کیا ہے۔ متی لکھتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کشتی پر سوار ہو کر اپنے شاگردوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اچانک تیز ہوا چلنی شروع ہوئی۔ تمام لوگ خوف کے مارے چیخیں مارنے لگے۔ مگر حضرت مسیح علیہ السلام سوتے رہے. آپ کو جگایا گیا آپ نے ہوا کو ڈانٹا تو ہوا تھم گئی۔ مرقس اور لوقا نے بھی اس واقعہ کو تحریر کیا ہے۔ ان کے الفاظ بھی وہی ہیں جو الفاظ متی نے اختیار کیئے ہیں۔

تضاد

یوحنا ان تینوں سے اختلاف کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ کشتی میں صرف شاگرد سوار تھے ہوا بہت تیز تھی اور تند لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لوگ خوف زدہ تھے اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ یسوع علیہ السلام پانی پر چل رہے ہیں۔ پہلے تو وہ ڈر گئے لیکن مسیح علیہ اسلام کی آواز سن کر پہچان گئے۔ کہ مسیح علیہ اسلام پانی پر چل رہے ہیں۔ آپ کشتی میں پہنچ گئے اور کشتی فوراً" منزل مقصود تک پہنچ گئی۔ یوحنا کی انجیل میں عنوان "یسوع کا پانی پر

چلنا" متن کے الفاظ نہیں۔ یہ الفاظ اس تضاد بیانی کو چھپانے کے لئے بڑھائے گئے ہیں۔ پروٹیسٹینٹ فرقہ کے ترجمہ میں عنوانات نہیں ہیں۔

تپ سے شفاء

متی نے لکھا ہے۔ کہ یسوع علیہ السلام پطرس کے گھر تشریف لے گئے۔ جب گھر داخل ہوئے تو پطرس کی ساس بخار سے پڑی تھی آپ علیہ السلام نے اس کا ہاتھ چھوا اور اسے اٹھا دیا۔ اسی سے وہ عورت صحت یاب ہو گئی اور خدمت کرنے لگی۔

مرقس نے یہی واقعہ متی کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جبکہ لوقا کا انداز مختلف ہے۔ وہ پطرس کی جگہ شمعون کا نام لیتا ہے۔ اسے ہم تضاد پر محمول نہیں کرسکتے کیونکہ شمعون ہی کو پطرس کہتے ہیں لیکن لوقا نے متی اور مرقس سے اختلاف کرتے ہوئے ہاتھ چھونے کی جگہ تپ کو جھڑکنا لکھا ہے۔ یوحنا نے اس واقعہ کو بیان نہیں کیا۔

اندفاع آسیب

مرقس باب پانچ کی ابتداء میں اندفاع آسیب کا یہ واقعہ لکھتا ہے کہ یسوع علیہ السلام جرجاسیوں کے علاقے میں تھے تو قبرستان کے نزدیک انہیں ایک آسیب زدہ شخص ملا جس میں کئی بدروحیں تھیں اور وہ بیڑیوں سے بھی قابو میں نہیں آتا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بدروحوں کو نکالا اور اسے شفاء دی۔ وہاں کے لوگ خوف زدہ ہوئے اور مسیح علیہ السلام سے گزارش کی کہ وہ یہاں سے چلا جائے کیونکہ ان بدروحوں نے ان کے سوروں کا ایک ریوڑ تباہ کر دیا تھا۔

تضاد

متی کے بیان کے مطابق آسیب زدہ شخص ایک نہیں بلکہ دو تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے دونوں کو شفاء بخشی۔ (متی باب ۸: ۲۸ تا ۳۴)

لوقا کے بیان کے مطابق بھی آسیب زدہ ایک تھا لوقا صرف اس قدر اضافہ کرتا ہے کہ وہ ننگا تھا۔ اور جب وہ صحت یاب ہو گیا تو یسوع علیہ السلام کی خدمت میں رہنے کا ارادہ کر لیا لیکن یسوع علیہ السلام نے اسے جرجاسیوں کے علاقے میں رہنے کا حکم فرمایا اور حکم دیا کہ وہ اس معجزہ کی تشہیر کرے حالانکہ اس سے پہلے ہر جگہ یسوع معجزات کے اخفاء کا حکم دیتا ہے۔ ممکن ہے علماء شرع کی مخالفت سے بچنے کے لئے آپ ایسا کرتے ہوں اور یہ علاقہ دور ہونے کی وجہ سے محفوظ ہو۔ یوحنا نے اس واقعہ کو بیان نہیں کیا۔

مفلوج ہاتھ کو درست کر دیا:

متی کے بیان کے مطابق آپ علیہ السلام یہودیوں کے ایک عبادت خانے میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک ایسا آدمی دیکھا جس کا ایک ہاتھ سوکھا ہوا تھا آپ نے اس کے ہاتھ کو درست فرما دیا جس پر علماء شرع اعتراض کرنے لگے کہ یسوع سبت کو شفاء دیتا ہے۔ آپ نے انہیں سمجھایا کہ یہ کام سبت کے احترام کے منافی نہیں۔ مرقس اور لوقا نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے یوحنا اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سارے معجزات کو اناجیل نے بیان کیا ہے۔ طوالت کے خوف سے چھوڑتا ہوں۔ ممکن ہے آپ علیہ السلام کے

معجزات کے بیان میں کچھ وضع کردہ ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسیح علیہ السلام انبیاء سابقین کی طرح صاحب معجزہ نبی تھے۔ آپ علیہ السلام نے بعض ایسے معجزے بھی کیے جن میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ ان معجزات سے جزوی فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے۔

رفع آسمانی

آپ کے معجزات میں سے ایک عظیم معجزہ رفع آسمانی ہے۔ قرآن کریم نے اس معجزہ کی تصدیق کی ہے۔ قرآن کریم میں ایک سے زائد مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے۔ اہل اسلام اس معجزہ کو قطعی اور یقینی خیال کرتے ہیں۔ اور اس کی کسی ایسی تاویل کو نہیں مانتے جس سے اس معجزہ کی روح متاثر ہوتی ہو۔

قرآن کریم آپ علیہ السلام کے اس معجزے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۝

(آل عمران ۵۵)

"یاد کرو جب فرمایا اللہ نے اے عیسیٰ! یقیناً میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا تمہیں اور اٹھانے والا ہوں تمہیں اپنی طرف اور پاک کرنے والا ہوں تمہیں ان لوگوں کی تہمتوں سے جنھوں نے (تیرا) انکار کیا۔

مسیحی عقیدہ

مسیحی علماء کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا۔ لیکن اس سے قبل یہودی علماء نے آپ کو حکومت سے صلیب

دلوائی۔ آپ علیہ السلام صلیب پر فوت ہو گئے۔ آپ کو دفن کیا گیا۔ تین دن آپ قبر میں رہے لیکن اگلی صبح آپ دوبارہ زندہ ہو گئے۔ آپ شاگردوں اور عقیدت مندوں کو نظر آئے۔ انہیں اس معجزہ کا یقین دلایا اور کچھ دن بعد قیامت تک کے لئے آسمان پر چلے گئے۔ اب خدا کی دائیں جانب بیٹھے ہیں۔ قیامت کے دن عدالت کرنے تشریف لائیں گے۔

کیا مسیح مصلوب ہوئے

قرآن کریم اس عقیدے کا رد کرتا ہے۔ بعض مسیحی علماء قرآن کریم کی مذکورہ آیت کے لفظ متوفی سے اپنا عقیدہ ثابت کرتے ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کی تحقیق پیش کر دی جائے۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری صاحب کی تفسیر ضیاء القرآن سے اس لفظ کی تصریح پیش کی جاتی ہے۔ آپ اس آیت کریمہ کی تفصیل میں لکھتے ہیں۔ "علم معانی کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے۔ کہ اگر کسی لفظ کا ایک حقیقی معنی ہو اور دوسرا مجازی ہو تو حقیقی معنی کو مجازی معنی پر ترجیح دی جائے گی۔ ہاں اگر کوئی ایسا قرینہ پایا جائے جس کے ہوتے ہوئے حقیقی معنی متعذر ہو تو اس وقت معنی حقیقی کو ترک کر کے معنی مجازی مراد لیا جائے گا۔ لیکن ایسے قوی قرائن موجود ہوں جو حقیقی معنی لینے کے موید ہوں تو اس حالت میں حقیقی معنی کو ترک کر کے مجازی معنی مراد لینے پر اصرار کرنا تو الٹی گنگا بہانے کے مترادف ہے۔ اب آپ لفظ "توفی" کے معنی پر غور فرمائیے۔ تاج العروس میں لفظ "وفی" کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ وتوفاہ ای لم یدع منہ شیئا۔ یعنی پورے کا پورا لے لیا۔ اور اس سے کوئی

چیز باقی نہیں رہنے دی۔ امام ابی عبداللہ القرطبی'

اَلْجَامِعُ لِاَحْکَامِ الْقُرْآنِ میں لکھتے ہیں۔ تَوَفَّیْتُ مَالِیْ مِنْ فُلَانٍ اَیْ قَبَضْتُہٗ یعنی میں نے اس سے سارا مال واپس لے لیا۔ یہ تو ہے لفظ توفی کا حقیقی معنی۔ ہاں یہ موت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مجازی معنی جیسے صاحب تاج العروس نے لکھا ہے۔

ومن المجاز ادرکته الوفاة ای الموت والمنیة وتوفی فلانا اذ مات وتوفاه الله عزوجل ازا قبض روحه۔ اب آپ خود فیصلہ فرمالیں کہ ایک لفظ کا حقیقی معنی ترک کر کے بغیر قرینہ کے اس سے مجازی معنی اخذ کرنے پر اصرار کرنا اس لفظ کے ساتھ کتنی بے جا زیادتی ہے۔ اور یہاں صرف اتنا ہی نہیں کہ مجازی معنی لینے کا کوئی قرینہ موجود نہیں بلکہ ایسے قوی قرائن موجود ہیں جو اس لفظ کے حقیقی معنی لیے جانے پر دلالت کرتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے وہ کون سے ایسے قرائن ہیں تو اس کے متعلق عرض ہے کہ ایک تو اس آیت کا سیاق و سباق اس امر کا قوی قرینہ ہے۔ یہاں گفتگو نجران کے عیسائیوں سے ہو رہی ہے۔ جو حضرت مسیح کی الوہیت کے قائل تھے۔ مقصد کلام ہے اثبات توحید باری تعالیٰ اور بطلان الوہیت مسیح۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہوتے تو کتنی صاف بات تھی کہ نجران کے عیسائیوں سے کہہ دیا جاتا ہے کہ جن کو خدا مانتے ہو وہ تو مر چکے ہیں۔ اور جو مر جائے کیا وہ بھی کہیں خدا بن سکتا ہے۔ لیکن قرآن کا اس اسلوب کو اختیار نہ کرنا بلکہ اس انداز کو اپنانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کی اس آیت کا مدعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کو بیان کرنا نہیں۔ دوسرا واضح قرینہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد گرامی

ہے۔

قَالَ الْحَسَنُ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تعالیٰ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ لِلْیَھُوْدِ اِنَّ عِیْسٰی لَمْ یَمُتْ وَ اِنَّہٗ رَاجِعٌ اِلَیْکُمْ قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ○

رسول اللہ ﷺ نے یہود کو فرمایا کہ عیسیٰ مرے نہیں اور قیامت سے پہلے وہ تمہاری طرف لوٹ کر آئیں گے۔ ان تصریحات کی موجودگی میں حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی مراد نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے جمہور مفسرین اس حقیقی معنی کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

متوفیک ای مستوفی اجلک و موخرک الی اجلک المسمی عاصما ایاک عن قتلھم۔○

(بیضاوی)

اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی مقررہ میعاد تک زندہ رکھے گا۔ اور تمہیں قتل سے بچائے گا۔

مُتَوَفِّیْکَ اَیْ مُسْتَوْفِیْ اَجَلَکَ مَعْنَاہُ اِنِّیْ عَاصِمُکَ مِنْ اَنْ یَقْتُلَکَ الْکُفَّار (کشاف)۔ امام ابن جریر لکھتے ہیں۔ وَاَوْلَی الْاَقْوَالِ بِالصِّحَۃِ عِنْدَنَا قَوْلُ مَنْ قَالَ مَعْنٰی ذَالِکَ اِنِّیْ قَابِضُکَ مِنَ الْاَرْضِ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ لِتَوَاتُرِ الْاَخْبَارِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ۔

یعنی میرے نزدیک صحیح ترین قول یہ ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھے زمین سے قبض کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں کیونکہ

حضور ﷺ کی احادیث متواتر سے یہی چیز ثابت ہے کہ آپ کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا"

(ضیاء القرآن جلد اول)

سورۃ نساء میں قتل اور صلیب کی نفی صراحتاً کی گئی ہے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔

"حالانکہ نہ انہوں نے قتل کیا اور نہ اسے سولی چڑھا سکے بلکہ مشتبہ ہو گئی ان کے لئے حقیقت"

اس آیت کے آخری الفاظ میں تاکید مزید کے لئے فرمایا

"وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ"

"اور نہیں قتل کیا انہوں نے اسے یقیناً بلکہ اٹھا لیا ہے۔ اسے اللہ نے اپنی طرف"

اس تصریح کے بعد یہ کہنا کہ یہودیوں نے صلیب دلوا کر مسیح علیہ السلام کو قتل کروا دیا محض گمان ہے۔ اور بائبل کے مطالعہ سے یہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مسیح علیہ السلام زندہ اٹھا لیے گئے لیکن اہل کتاب پر حقیقت مشتبہ ہو گئی اور اب وہ محض ظن و تخمین کی پیروی کر رہے ہیں۔

پوری عیسائیت کا مرکز و محور مسیح علیہ السلام کی صلیبی موت ہے اس موضوع پر جس قدر لکھا گیا ہے۔ شاید ہی کسی اور موضوع پر لکھا گیا ہو گا۔ اناجیل اربعہ میں صلیبی موت اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلکہ عیسائیوں کا تو یہ اعتقاد ہے کہ سلسلہ نبوت و رسالت مسیح کی تصلیب کا

ابتدائیہ ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کہ اناجیل میں صلیبی موت کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

پہلے میں اناجیل اربعہ کی روشنی میں واقعہ صلیب کو اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں۔

مسیح علیہ السلام نے جب اعلان نبوت کیا تو آپ کی عمر مبارک تیس سال تھی۔ آپ گلیل (جلیل) کے شہر ناصر میں قیام پذیر تھے اور مریم اور یوسف بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ آپ اپنے وعظ میں علماء شرع کی من گھڑت آبائی روایات پر تنقید کرتے تھے۔ اور فقیہوں اور فریسیوں کو دینی اجارہ داری اور بے عملی پر ٹوکتے تھے۔ یہ اور چند اور وجوہات کی بناء پر علماء شرع مسیح کے خلاف ہو گئے اور آپ پر دو الزام لگائے۔ ایک الزام تو یہ لگایا کہ یہ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہہ کر کفر کرتا ہے اور دوسرا الزام سیاسی لگایا کہ یہ اپنے آپ کو یہودیوں کا بادشاہ کہتا ہے۔ شاید یہ دوسرا الزام مسیح کو پھانسی دلوانے کے لئے لگایا گیا۔ مسیح علیہ السلام کو یہودہ اسکریوتی (جو منافق تھا اور اپنے آپ کو شاگرد مسیح ظاہر کرتا تھا) نے تیس روپے کے عوض پکڑوا دیا آپ پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا رومی گورنر پیلاطس نے کوشش کی کہ بے گناہ کو پھانسی نہ ہو لیکن یہودی علماء کے ہاتھوں مجبور ہو کر یسوع کو دو ڈاکوؤں کے درمیان پھانسی دے دی یسوع پھانسی پر لٹک کر مر گیا انہیں دفن کیا گیا لیکن تیسرے دن مردوں میں سے جی اٹھا اور آسمانوں پر چڑھ گیا۔

اتباع ظن

قرآن کریم نے تصلیب کے عقیدے کو یہود و نصاریٰ کی غلط فہمی اور اور اتباع ظن قرار دیا۔ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ "اور یقیناً جنہوں نے اختلاف کیا ان کے بارے وہ بھی شک و شبہ میں ہیں۔ ان کے متعلق نہیں ان کے پاس نہیں کوئی یقینی علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی"

(نساء ۱۵۷)

اب دیکھئے قرآن کریم کی صداقت اور بائیبل کے مصنفین کا اتباع الظن کیسے واضح ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے غدار (یہوداہ) کی نشان دہی کی اناجیل کا اس بارے میں تضاد ہے متی کے نزدیک یہ یسوع نے کہا کہ جو

میرے ساتھ طباق میں ہاتھ ڈالے گا وہ مجھے پکڑوائے گا۔ جبکہ یوحنا کے نزدیک جس کو نوالہ ڈبو کر دوں وہ مجھے پکڑوائے گا۔

۲۔ "تم میں سے ایک مجھے پکڑوائے گا وہ بہت دل گیر ہوئے اور ہر ایک اسے کہنے لگا اے خداوند کیا میں ہوں اس نے جواب میں کہا جس نے میرے ساتھ طباق میں ہاتھ ڈالا وہی مجھے پکڑوائے گا......"

(متی ب۲۶:۲۱ تا ۲۳)

سچ سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑوائے گا
شاگرد شبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اس کے شاگردوں میں سے ایک شخص جس سے یسوع محبت رکھتا تھا یسوع کے سینے کی طرف جھکا ہوا کھانا کھانے بیٹھا تھا پس شمعون پطرس اس سے اشارہ کر کے کہا کہ بتا تو وہ کس کی نسبت کہتا ہے اس نے اسی طرح یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا کہ اے خداوند وہ کون ہے۔ یسوع نے جواب دیا جسے میں نوالہ ڈبو کر دے دوں گا وہی ہے۔ پس اس نے نوالہ ڈبویا اور شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دے دیا۔

(یوحنا ب۱۳:۲۱ تا ۲۶)

۲۔ مسیح علیہ السلام کی گرفتاری میں تضاد ہے متی کہتا ہے کہ غدار یہودہ نے سپاہیوں کو بتا دیا تھا کہ جس کو میں بوسہ دوں گا وہی مسیح ہو گا اسے پکڑ لینا سو غدار یہودہ نے بوسہ دے کر یسوع کی پہچان کروا دی اور

سپاہیوں نے یسوع کو گرفتار کر لیا۔ جب کہ یوحنا کہتا ہے کہ یسوع نے سپاہیوں کو خود بتایا کہ میں مسیح ہوں اور بوسہ لینے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

دونوں کی عبارت ملاحظہ کریں۔

متی لکھتا ہے کہ "اس کے پکڑوانے والے نے انہیں یہ کہہ کر نشان دیا تھا کہ جسے میں چوموں وہی ہے۔ اسے پکڑ لینا اور وہیں یسوع کے پاس آکر اس نے کہا اے ربی سلام! اور اس کو مکرر چوما"

(متی ب۲۶: ۴۸ تا ۴۹)

یوحنا لکھتا ہے "پس یہوداہ سپاہیوں کا گروہ اور سردار کاہنوں اور فریسیوں سے پیادے لے کر چراغوں، مشعلوں اور ہتھیاروں کے ساتھ وہاں آیا یسوع وہ سب کچھ جانتے ہوئے جو اس پر واقع ہونے کو تھا آگے بڑھا اور ان سے کہا تم کسے ڈھونڈتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ یسوع ناصری کو۔ یسوع نے ان سے کہا کہ میں ہی ہوں۔"

(یوحنا ب۱۸: ۳ تا ۵)

۳۔ صلیب کس نے اٹھائی؟

انجیل لوقا اور انجیل یوحنا میں تضاد ہے۔ لوقا کے نزدیک صلیب ایک دیہاتی شمعون کرینی نے اٹھائی ہے۔ جب کہ لوقا کے نزدیک صلیب خود مسیح اٹھا کر کھوپڑی کی جگہ تک لے گیا ملاحظہ کیجئے "اور جب اس کو لیے جاتے تھے تو جو دیہات سے آتا تھا پکڑ کر صلیب اس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے"

(لوقا ب۲۳: ۲۶)

یوحنا لکھتا ہے "پس وہ یسوع کو لے گئے اور وہ اپنی صلیب آپ اٹھائے ہوئے اس جگہ تک باہر گیا جو کھوپڑی کی جگہ کہلاتی ہے۔

(یوحنا ۱۹، ۱۷)

۴۔ جن لوگوں نے مسیح علیہ السلام کو لعن طعن کیا ان میں دونوں ڈاکو بھی شامل تھے یا صرف ایک ڈاکو شامل تھا۔ اور ایک اپنے ساتھی کو منع کر رہا تھا۔

متی اور مرقس میں لکھا ہے کہ دونوں ڈاکوؤں نے لعن طعن کیا جبکہ لوقا میں اس کے برعکس ایک ڈاکو لعن طعن کرتا ہے۔ اور دوسرا اپنے ساتھی کو روکتا ہے۔

"اور اسی طرح کی باتوں سے وہ ڈاکو بھی جو اس کے ساتھ مصلوب ہوئے اسے ملامت کرتے تھے۔"

(متی ۲۷: ۴۴)

مرقس کے الفاظ ہیں "اور وہ بھی جو اس کے ساتھ صلیب پر کھینچے گئے تھے اسے ملامت کرتے تھے۔"

(مرقس ب ۱۵: ۳۲)

اب لوقا کے الفاظ ملاحظہ کریں۔ "اور ایک ان بدکاروں میں سے جو صلیب پر لٹکائے گئے تھے اسے طعنہ دیکر بولا...... لیکن دوسرے نے جھڑک کر جواب میں کہا۔ کیا تو اب بھی خدا سے نہیں ڈرتا حالانکہ اسی سزا میں گرفتار ہے...... اور یسوع نے اس سے کہا میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ آج ہی تو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا۔"

(لوقا ۲۳: ۳۹ تا ۴۳)

۵۔ یسوع علیہ السلام کے آخری الفاظ کیا تھے؟

لوقا اور یوحنا میں تضاد ہے۔ دونوں کے الفاظ ملاحظہ کریں۔

لوقا لکھتا ہے:۔ "اے باپ میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے جان دے دی"

(لوقا ۲۳:۴۶)

یوحنا لکھتا ہے:۔ "پس یسوع نے جب سرکہ پیا تو کہا تمام ہوا اور اس نے سر جھکا کر جان دے دی"

(یوحنا ب ۱۹:۳۰)

۶۔ کیا عورتیں پھانسی کے وقت قریب تھیں یا دور؟

پہلی تینوں اناجیل کے حوالے سے وہ یہ منظر دور سے دیکھ رہی تھیں۔

"اور وہاں بہت سی عورتیں بھی تھیں جو دور سے دیکھ رہی تھیں"

(متی ب ۲۷:۵۵)

"اور کئی عورتیں بھی دور سے دیکھ رہی تھیں۔"

(مرقس ۱۵:۴۰)

"اور وہ عورتیں....... دور کھڑی ہو کر یہ باتیں دیکھ رہی تھیں"

(لوقا ب ۲۳:۴۹)

اب ان تینوں کے برعکس آخری انجیل، انجیل یوحنا کے الفاظ دیکھیں۔

"اور یسوع کی صلیب کے پاس اس کی ماں اور اس کی بہن ' حلفائی کی بیوی مریم اور مریم مجدلی کھڑی تھیں۔ یسوع نے اپنی ماں کو اور اس شاگرد کو جسے وہ پیار کرتا تھا۔ پاس کھڑے دیکھا اور اپنی ماں سے کہا اے خاتون! دیکھ تیرا بیٹا پھر شاگرد سے کہا دیکھ تیری ماں"

(یوحنا۱۹: ۲۵ تا ۲۷)

۷۔ قبر کا پتھر پہلے ہی لڑھکا ہوا تھا یا فرشتے نے قبر مسیح پر جانے والی عورتوں کے سامنے اسے لڑھکایا؟

متی کے نزدیک فرشتے نے عورتوں کے سامنے قبر سے اسے لڑھکا دیا اور زلزلہ آیا اور فرشتہ عورتوں سے مخاطب بھی ہوا۔

دیکھئے متی کے الفاظ۔ "اور سبت کے بعد ہفتہ کے پہلے دن پو پھٹتے مریم مجدلی اور دوسری مریم قبر کو دیکھنے آئیں اور دیکھو ایک بڑا زلزلہ آیا کیونکہ خداوند کا ایک فرشتہ آسمان سے اترا اور پاس آکر پتھر کو لڑھکا دیا۔ اور اس پر بیٹھ گیا...... فرشتے نے عورتوں سے خطاب کرکے کہا تم نہ ڈرو"

(متی ب ۲۸: ۱ تا ۶)

مرقس ' متی سے اختلاف کرتا ہے۔ "آپس میں کہتی تھیں کہ ہمارے لئے اس پتھر کو قبر کے منہ پر سے کون لڑھکائے گا۔ جب انہوں نے نگاہ کی تو اس پتھر کو لڑھکا ہوا دیکھا"

(مرقس ب ۱۶: ۳ ' ۴)

لوقا بھی مرقس سے اتفاق کرتا ہے۔ "اور انہوں نے پتھر کو قبر پر سے لڑھکا ہوا پایا"

(لوقا ب ۲۴: ۲)

یوحنا بھی ان دونوں سے اتفاق کرتا ہے۔ "اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا"

(یوحنا ب ۲۰: ۱)

۸۔ عورتیں جب قبر پر آئیں تو وقت کیا تھا؟

متی کے نزدیک پو پھٹنے' مرقس کے نزدیک سورج نکلنے کے بعد۔ لوقا کا بیان مبہم ہے۔ اور یوحنا متی سے اتفاق کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے اناجیل کی عبارتیں۔

متی: "اور سبت کے بعد ہفتہ کے پہلے دن پو پھٹتے مریم مجدلی اور دوسری مریم قبر کو دیکھنے آئیں"

(ب ۲۸: ۱)

مرقس:۔ "وہ ہفتہ کے پہلے دن بہت سویرے سورج نکلتے ہی قبر پر آئی"

(ب ۱۶: ۲)

لوقا:۔ "اور وہ ہفتہ کے دن علی الصباح ......"

(ب ۲۴: ۱)

یوحنا:۔ "وہ ہفتہ کے دن مریم مجدلی ایسے تڑکے کہ ہنوز اندھیرا ہی تھا قبر پر آئیں"

(ب ۲۰: ۱)

۹۔ عورتوں نے فرشتے کو کہاں دیکھا؟

متی کے بیان کے مطابق عورتوں نے فرشتے کو قبر سے باہر اس پتھر

پر بیٹھے دیکھا جسے اس نے قبر سے لڑھکایا تھا۔

"فرشتہ آسمان سے اترا اور پاس آکر پتھر کو لڑھکا دیا اور اس پتھر پر بیٹھ گیا۔

(متی ب ۲۸: ۲)

مرقس کے نزدیک قبر کے اندر فرشتہ انسانی صورت میں نظر آیا۔ اور قبر کے اندر جا کر انہوں نے ایک نوجوان کو سفید لباس پہنے دہنی طرف بیٹھا دیکھا"

(مرقس ۱۶: ۵)

لوقا کے نزدیک فرشتہ ایک نہیں تھا بلکہ دو فرشتے تھے جو قبر سے باہر کھڑے تھے۔ "اور ایسا ہوا کہ جب وہ اس بات سے حیرن تھیں تو دیکھو دو شخص براق پوشاک پہنے ان کے پاس آ کھڑے ہوئے"

(لوقا ب ۲۴: ۴ تا ۷)

یوحنا کا بیان ان تینوں سے کلیتہً مختلف اور متضاد ہے وہ لکھتا ہے "ہفتہ کے پہلے دن مریم مجدلی ایسے تڑکے کہ ہنوز اندھیرا ہی تھا۔ قبر پر آئی اور قبر سے پتھر کو ہٹا ہوا دیکھا۔ تب وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس دوڑی آئی جسے یسوع پیار کرتا تھا۔ اور ان سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے ہیں۔ اور ہم نہیں جانتیں کہ انہوں نے اسے کہاں رکھا ہے۔ تب پطرس اور وہ دوسرا شاگرد نکلے اور قبر کی طرف گئے۔ چنانچہ وہ دونوں دوڑے مگر دوسرا شاگرد پطرس سے بڑھ گیا۔ اور قبر پر پہلے پہنچا۔ اس نے جھک کر کتانی کپڑے پڑے ہوئے دیکھے اور رومال جو اس کے سر پر تھا ان کپڑوں کے ساتھ نہیں۔ مگر جدا لپٹا ہوا' ایک جگہ پڑا تھا..... تب وہ شاگرد اپنے گھر واپس چلے گئے۔ لیکن مریم باہر قبر پر کھڑی

روتی رہی اور روتی ہوئی جھکی اور قبر میں نظر کی اور جہاں یسوع کی لاش رکھی تھی۔ اس نے دو فرشتوں کو سفید پوشاک پہنے ایک سرہانے اور ایک پائینتی بیٹھے دیکھا۔ جنہوں نے اس سے کہا۔ بی بی تو کیوں روتی ہے۔

(یوحنا باب ۲۰: ۱ تا ۱۳)

یوحنا کا بیان اناجیل ثلاثہ سے بالکل مختلف ہے۔

متی سے اختلاف کیا اور کہا کہ پتھر پہلے ہی سے ہٹا ہوا تھا۔ فرشتہ ایک نہیں تھا بلکہ دو تھے۔ باہر نہیں بلکہ دونوں فرشتے قبر کے اندر تھے۔ مریم اور دوسری عورتیں پہلی دفعہ آئیں تو صرف لاش نہیں تھی واپس چلی گئیں۔ واپس پطرس اور پیارا شاگرد یوحنا ان کے ساتھ آئے لیکن متی کے نزدیک یہ سب کچھ نہیں ہوا بلکہ پہلی بار ہی فرشتہ نے بتادیا کہ یسوع جی اٹھا ہے۔ اب ان اناجیل میں اس واقعہ کا تقابلی مطالعہ کریں جگہ جگہ تضاد نظر آئے گا۔

دو صفحے پر پھیلا یہ واقعہ اگر اس قدر تضاد رکھتا ہے تو کیا اسے الہام کا نام دیا جا سکتا ہے وہ واقعہ جس پر پوری عیسائیت کی عمارت استوار کی گئی ہے اس کے استناد کی یہ حالت ہے تو باقی بیانات کی حالت کیا ہوگی۔ قرآن کریم نے اسے اتباع ظن کا نام بجا طور پر دیا ہے۔ اناجیل کے مطالعہ سے قرآن کریم کی حقانیت واضح ہو جاتی ہے۔

ان تضادات کی بناء پر بعض مسیحی محققین نے اعتراف کیا ہے کہ صلیب اور قیامت مسیح کا واقعہ الحاقی ہے۔

مرقس کی انجیل جو باقی تینوں انجیلوں کا ماخذ شمار کی جاتی ہے اس کے آخری باب کے متعلق دو نامور عیسائی محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ دوسری صدی عیسوی میں الحاق کیا گیا ہے۔ مقدس مرقس کی انجیل میں

نہیں تھا۔ مرقس کا آخری باب وہ ہے جس میں صلیب مسیح اور ان کے دوبارہ جی اٹھنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

اس بات کی تائید نسخہ سینا سے بھی ہوتی ہے۔ نسخہ سینا میں صلیب اور قیامت مسیح کا واقعہ درج نہیں ہے۔ یاد رہے کہ نسخہ سینا چوتھی صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے اور روس کے شاہی کتب خانے میں اب تک موجود ہے۔ مشہور جرمن عالم ڈاکٹر ٹشنڈرف نے ۱۸۵۹ء میں کوہ طور کے دامن میں واقع خانقاہ سے زار روس کی وساطت سے حاصل کیا تھا۔

(صحف سماوی)

ہو سکتا ہے کہ کوئی مسیحی عالم یہ کہہ کر اعتراض کرے کہ کہ نسخہ سینا عیسائیوں کے نزدیک معتبر نہیں اس میں اپوکریفا (جعلی کتابیں) بھی شامل ہیں تو ہم جواب دیں گے کہ صلیب اور قیامت کا واقعہ بہرحال غیر مستند ہے کئی عیسائی علماء آج تک اس کے الہامی ہونے کا انکار کر رہے ہیں۔ اسی لئے ۱۸۸۱ء میں طبع ہونے والے انگریزی ترجمہ روائزڈ ورشن میں اس باب کی آخری گیارہ آیات نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ ترجمہ عیسائیوں میں مقبول اور متداول ہے

اناجیل اربعہ کی بعض آیات سے مستفاد ہوتا ہے مسیح علیہ السلام نے اپنے صعود آسمانی کی خبر دی۔ ان آیات میں قتل اور صلیب کا اشارہ تک نہیں۔ انجیل یوحنا میں آپ یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس نے پھر ان سے کہا کہ میں جاتا ہوں تم نہیں آسکتے۔"

(یوحنا باب ۸:۲۱)

اسی طرح یوحنا لکھتا ہے کہ یروشلم میں کھڑے ہو کر آپ نے

فرمایا۔

"اور جب زمین سے اوپر اٹھایا جاؤں گا تو سب کو اپنے پاس کھینچوں گا۔"

(۱۲: ۳۲)

اسی باب کی آیت ۳۵ میں ہے۔ "اور تھوڑی دیر تک نور تمہارے درمیان ہے جب تک نور تمہارے درمیان ہے چلے چلو" ایک اور مقام پر حواریوں کو اپنے صعود آسمانی کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "اے بچو! میں اور تھوڑی دیر تک تمہارے ساتھ ہوں۔ تم مجھے ڈھونڈو گے اور جیسا کہ میں نے یہودیوں سے کہا کہ جہاں میں جاتا ہوں تم نہیں آسکتے۔ ویسا ہی اب میں تم سے کہتا ہوں۔"

(یوحنا ۱۳: ۳۳)

انجیل برنباس جسے عیسائی ماننے کے لئے تیار نہیں اس کے مستند یا غیر مستند ہونے کے متعلق بعد میں گفتگو کی جائے گی۔ یہاں اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اناجیل اربعہ پر جو اعتراض وارد ہوتے ہیں وہی اعتراض انجیل برنباس پر کئے گئے ہیں اسے ایک طویل عرصہ تک مسیحیوں میں قبول عام حاصل رہا ہے قدیم نسخہ جات کی فہرست میں اس کا نام بھی آتا ہے اس طرح اگر یہ مستند انجیل نہیں بھی تو کم از کم مسیح علیہ السلام کے قریب ترین دور کی ایک کتاب تو یقینی ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس کتاب کو عیسائیوں کا ایک فرقہ اصل انجیل تسلیم کرتا رہا ہے۔ اس انجیل میں مسیح علیہ السلام کی تصلیب کا رد کیا گیا ہے۔ صرف ایک آیت لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ "اور اس نے بہتوں کو' جو سمجھتے تھے کہ وہ مر کر جی اٹھا ہے۔ یہ کہہ کر ملامت کی تو کیا تم مجھے اور خدا کو جھوٹا سمجھتے ہو خدا نے تو مجھے تقریباً

دنیا کے خاتمے تک زندگی عطا کی ہے۔ جیسا میں تم سے کہہ چکا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں نہیں مرا بلکہ یہوداہ غدار۔ خبردار ابلیس تمہیں فریب دینے کی کوشش کرے گا۔ مگر تم سارے اسرائیل میں اور دنیا بھر میں میرے گواہ رہنا۔

(انجیل برنباس ص ۲۸۵) (مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لاہور)

دنیا کے خاتمے تک زندگی عطا کی ہے۔ جیسا میں تم سے کہہ چکا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں نہیں مرا بلکہ یہوداہ غدار۔ خبردار ابلیس تمہیں فریب دینے کی کوشش کرے گا۔ مگر تم سارے اسرائیل میں اور دنیا بھر میں میرے گواہ رہنا۔

(انجیل برناباس ص ۲۸۵) (مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لاہور)

کفارہ

کفارہ کی تعلیم مسیحی عقائد میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ آنسلیم (Ansim) کی یادگار زمانہ کتاب "خدا انسان کیوں بنا" ۱۰۹۸ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس وقت سے آج تک یہ تعلیم مسیحی علم الٰہی کا مرکزی موضوع بنی ہوئی ہے۔ اگرچہ کفارہ کی تفسیر میں مسیحی علماء کے مختلف خیال ہیں لیکن آج روایت پرست علماء میں سے کوئی بھی اس تعلیم کو من گھڑت قرار نہیں دیتا اختصار کے ساتھ کفارہ کی تعلیم کا نظریہ پیش خدمت ہے

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صورت پر پیدا کیا تھا اور آدم اور حوا جن سے آگے نسل انسانی چلی وہ جنت میں قیام پذیر تھے اور نعیم جنت سے لطف اندوز ہونے کی ان کو کھلی چھٹی تھی صرف نیک و بد کی پہچان کے درخت کو چھونا منع کیا گیا تھا آدم اور حوا جنت میں ابدی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن شیطان جو انسان کا ابدی دشمن رہا ہے اس کی کوشش رہی کہ وہ آدم اور حوا کو اس ممنوعہ درخت کے کھانے پر آمادہ کرے لہذا وہ جنت میں پہنچا اور آدم اور حوا کو پھل کھانے پر آمادہ کرلیا پھل کھاتے ہی آدم اور حوا کی فطرت بدل گئی اور وہ خدا سے دور ہو گئے۔ اللہ نے انہیں جنت سے نکال دیا مگر خدا جو انسان سے محبت رکھتا ہے وہ

نہیں چاہتا کہ انسان ابدی موت مرے اور خدا سے دور رہے۔ اللہ نے چاہا کہ انسان کا گناہ جو آدم اور حوا کی فطرت بدل گئی اور وہ خدا سے دور ہو گئے۔ اللہ نے انہیں جنت سے نکال دیا مگر خدا جو انسان سے محبت رکھتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ انسان ابدی موت مرے اور خدا سے دور رہے۔ اللہ نے چاہا کہ انسان کا گناہ جو آدم و حوا کی وجہ سے منتقل ہوتا آیا ہے اسے معاف کیا جائے۔ لیکن یونہی معاف کر دینا کی صفت عدل کے خلاف ہے اس لئے گناہ کے کفارہ کی ضرورت پیش آئی۔ گناہ کا کفارہ موت ہے لہٰذا ضروری پایا کہ انسان گناہ کے بدلے موت قبول کرے خدا نے دیکھا کہ انسانوں میں سے تو کوئی بھی ایسا نہیں جو گناہ سے پاک ہو۔ اور کفارہ کے لئے بے گناہ اور راستباز کی ضرورت ہے۔ سو اس مقصد کے لئے خدا کے اقنوم ثانی نے مریم مقدسہ کی وساطت سے تجسم اختیار کیا۔ چونکہ وہ خدا تھا جو کنواری مریم سے تولد ہوا اور انسانی صورت میں جلوہ گر ہوا تھا اس لئے وہ قربانی دے سکتا تھا۔ ایسا ہی ہوا خدا نے تجسم اختیار کیا' دنیا کی لعنت و ملامت کو برداشت کیا۔ انسان کے موروثی گناہ کو خود اٹھالیا۔ اور اس گناہ کی ہلاکت خیزی کو فنا اور ختم کرنے کے لئے پیلاطس کے زمانے میں صلیب پر مرا اور تیسرے دن مردوں سے جی اٹھا۔ اپنے شاگردوں اور بعض دوسرے ایمانداروں سے ملاقات کی۔ انہیں اپنی موت اور پھر زندہ ہونے کا یقین دلایا اور انہیں تلقین کی کہ پوری دنیا میں یہ منادی کریں کہ جو کوئی مسیح کی صلیبی موت پر ایمان لائے وہ شریعت کی لعنت سے چھوٹ گیا۔ وہ کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو ایمان کی وجہ سے اچھی جزاء کا اور ہمیشہ کے لئے زندگی کا حقدار ہے۔ کیونکہ مسیح نے صلیب پر موت قبول کر کے قیامت تک کے ہونے والے گناہوں کا کفارہ دے دیا۔ بس جو ایمان کے ذریعے

اس موت میں شامل ہو جائے گا۔ زندہ و جاوید ہو جائے گا۔ اور گناہ کی ہولناکی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ کیونکہ یہ تو مسیح کے ذریعے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر چکا ہے اور جو کفارہ ادا کر چکا ہے اس نے گناہوں پر قابو پا لیا ہے اور ایمان کی وجہ سے اس کی فطرت تبدیل ہو چکی ہے۔ اب وہ پاکباز ہے اور خدا تعالیٰ کے قریب ہے اور اللہ تعالیٰ کی صورت پھر اس کو مل گئی ہے۔

کفارہ کسے دیا جائے:

اس سلسلے میں مسیحی علماء کا اختلاف ہے۔ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ یہ کفارہ شیطان کو دیا گیا کیونکہ انسان نے گناہ کر کے اپنے آپ کو شیطان کی ملکیت میں دے دیا شیطان سے رہائی دینے کے لئے شیطان کو کفارہ اور فدیہ دینے کی ضرورت پیش آئی۔ شیطان کا مطالبہ یہ ہے۔ کہ انسان موت مرے یہی اس کا کفارہ ہے۔ نیز اس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اس کفارہ کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو معصوم ہو اور اس میں گناہ نہ ہو۔ شیطان نے یہ مطالبہ اس لئے کیا تاکہ یسوع جو راستباز ہے اور شیطان پر فتح پا سکتا ہے اس سے خلاصی پا لے۔ عدل کے تقاضے کو پورا کرنے اور فدیہ دینے کی غرض سے مسیح جو درحقیقت خدا تھا اور شیطان جسے نہیں جانتا تھا۔ صلیب پر مرا اور تیسرے دن جی کر گناہ اور موت پر فتح حاصل کر لی۔ اس طرح بیک وقت گناہ کا کفارہ بھی ادا ہوا اور انسانیت کو مسیح کے وسیلہ سے موت پر فتح حاصل ہو گئی۔ اب اس فتح میں جو شامل ہونا چاہے اس کے لئے آسان ہے۔

اس نظریے کو غالب نظریہ، نظریہ فدیہ، مشرقی نظریہ، یونانی نظریہ

اور مستند نظریہ کے نام دیے جاتے ہیں۔ اس نظریہ کے قائل علماء میں ایرینیوس، دمشق کے جید عالم جان' اور غین (orign) اثنا سیوس باسیل' گریگوری، گریگوری از نزیانزس' سکندریہ کا قورلوس' یروشلم کا قورلوس وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرا نظریہ یہ ہے۔ کہ فدیہ نہیں تھا جو مسیح کی صلیب کی صورت میں شیطان کو ادا کیا گیا بلکہ ہوا یہ کہ شیطان نے گناہ کے ذریعے انسان کو خدا سے لے لیا اور اپنی ملکیت سے فساد کرواتا رہا لیکن مسیح کو صلیب دلوا کر شیطان نے اپنے حق سے تجاوز کیا کیونکہ مسیح میں تو گناہ نہیں تھا۔ لہٰذا شیطان کو اس جرم کا یہ فدیہ دینا پڑا کہ وہ اپنے قبضے سے انسان کو رہائی دے۔ گویا شیطان نے خدا کو کفارہ دیا اور اس کفارے میں مسیح کی موت سے انسان کو شیطان کے قبضے سے رہائی ملی۔ اس نظریے کو سب سے پہلے پیش کرنے والا او گسٹین ہے۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان نے گناہ کر کے خدا سے دوری اختیار کر لی اللہ تعالیٰ چونکہ محبت کرنے والا ہے اس لئے اس نے چاہا کہ وہ ہمیں اپنا قرب عطا کرے۔ لیکن انسان کے گناہ اور خصوصاً موروثی گناہ رکاوٹ بن گئے۔ لہٰذا مسیح نے رضاکارانہ طور پر انسانوں کی طرف سے خدا کو فدیہ دیا اور ہمارے گناہوں کو خود اٹھا لیا اس طرح عدل کا تقاضا پورا ہوا اور انسان ابدی موت سے بچ گیا اس نظریہ کا پیش کرنے والا ایک آرمنی مفکر گروتیوس (Grotius) ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم ترین نظریہ "نظریہ تقلید" ہے جسے سب سے پہلے سوسینس (Socinus) نے پیش کیا۔ اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح نے صرف ان معنوں میں ہمارے گناہ اٹھائے ہیں کہ اس نے

ہمیں انہیں چھوڑنے کے لئے اکسایا اور اس طرح وہ انہیں دور لے گیا۔ گویا مسیح راہ نجات بتانے کی بناء پر نجات دہندہ ہے۔ مسیحی حضرات سوسینس کے نظریے کو کسی صورت قبول نہیں کرتے۔

کیا مسیح سب کے لئے مرا

اس بارے میں مسیحی علم الٰہی طرح طرح کے نظریات میں بٹ گیا ہے ایک نظریہ تو یہ کہ مسیح تمام کا کفارہ ادا کر گیا ہے۔ نیک 'بد' مسیحی 'غیر مسیحی کی قید کے بغیر تمام لوگ نجات دہندہ کے وسیلہ سے نجات پا چکے ہیں۔ اب کسی شخص کو نیک اعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ عقیدہ خاصا خطرناک ہے۔ لیکن اس نظریہ کو سوائے چند لوگوں کے کوئی مسیحی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مسیح صرف برگزیدوں کے لئے صلیب پر مرا ہے۔ یعنی کفارہ محدود ہے۔ اس نظریہ کو کیلون کے پانچ نکات میں سے حاصل کیا گیا ہے۔ یعنی کفارہ محدود ہے اس نظریہ کو کیلون کے پانچ نکات میں سے حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن اس نظریہ کو بھی زیادہ پذیرائی حاصل نہیں رہی ہے۔ ایک نظریہ ان دونوں نظریوں کے بین بین ہے۔ اور اکثر مسیحی اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

"مسیح سب کے لئے مرا لیکن گناہوں کی معافی صرف ایمانداروں کو ملتی ہے اور صرف وہی بچ جاتے ہیں۔" غالباً اس نظریہ کو اریوس کے نظریہ سے اخذ کیا گیا ہے اور آرمینی اور لوتھرن علماء اسی کے قائل ہیں۔

قارئین آپ نے اناجیل اربعہ کی روشنی میں مسیح علیہ السلام پر صلیبی موت کے الزام میں تضاد بیانی کو ملاحظہ کیا جسے قرآن کریم نے اتباع

ظن سے موسوم کیا ہے۔ پھر آپ نے کفارہ کے متعلق مسیحی تعلیمات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ بھی اناجیل کا باہمی تضاد ہے۔ کیونکہ کہیں مسیح علیہ السلام کی طرف یہ تعلیم منسوب کی گئی ہے۔ کہ وہ تمام کے لئے صلیب دیا گیا کہیں لکھ دیا کہ صرف برگزیدوں کے خاطر اور کہیں لکھ دیا گیا کہ صرف ایمانداروں کے لئے کفارہ کا نظریہ عقل کی کسوٹی پر ہرگز پورا نہیں اترتا۔

حضرت آدم ابوالبشر سے جو خطا سرزد ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کے بعد معاف کر دیا تھا۔ قرآن کریم میں ہے فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ○

۱۔ کسی بے گناہ کو پھانسی دے دینا اور مجرم کو نہ صرف بری الذمہ قرار دے دینا بلکہ جنت کا مستحق قرار دینا بے انصافی کی انتہاء ہے۔ خدا کی ذات ایسی بے انصافی سے پاک ہے۔ کہ مجرم آدم کو چھوڑ دیا اور مسیح کو پھانسی دے کر آدم اور حواء اور ان کی نسل کا گناہ معاف کر دیا۔

۲۔ گناہ کی سزا موت ہے۔ گناہ ہر بچہ آدم سے سرزد ہوا۔ لہٰذا تمام لوگوں کے گناہ کی واحد صورت یہ ہے کہ تمام کو صلیب دی جائے۔ صرف ایک موت ایک جرم کا کفارہ بن سکتی ہے۔

۳۔ بغیر سزا کے معاف کرنا اللہ کی صفت عدل کے خلاف ہے تو سزا دیکر معاف کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کے خلاف ہے۔ بلکہ اللہ نے اسے جرم کی پوری پوری سزا دی ہے۔ اس طرح نہ تو بے گناہ کو صلیب دینے سے اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا تقاضا پورا ہوتا ہے اور نہ ہی صفت رحمت کا تقاضا پورا ہوتا ہے۔

۴۔ کفارہ کی تعلیم سے اللہ تعالیٰ اگر ایک طرف عادل نظر آتا

ہے تو دوسری طرف منتقم بھی ہے اور مجبور اور شیطان کا نعوذ باللہ با جگزار بھی۔ شیطان نے جو گناہ کیا تو اس کو سزا نہیں دی لیکن آدم نے جو گناہ کیا اس کا کفارہ شیطان مردود کو دیتا نظر آتا ہے عجیب سوچ ہے۔

۵۔ چونکہ مسیح نے اپنی الٰہی طبیعت میں دکھ نہیں اٹھایا اس لئے اس کے دکھوں کی قیمت لامحدود نہیں ہو سکتی۔

۶۔ اگر مسیح کی موت ہماری موت کا معاوضہ بن سکتی ہے۔ تو مسیح کی راستبازی بھی ہمارے اندر راستبازی پیدا کر سکتی تھی۔ مسیح کی راستبازی نسل آدم کو کیوں نہیں دے دی گئی۔

۷۔ بائبل عہد قدیم کے مطابق تو اس گناہ کی سزا تینوں مجرموں کو دی جا چکی ہے۔ سانپ کو یہ سزا ملی کہ "ملعون ہے تو۔ تمام چرندوں اور درندوں میں تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا۔ اور اپنی زندگی کے تمام ایام کو خاک چکھے گا۔ میں تیرے اور عورت کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ بلکہ تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان۔ وہ تیرے سر کو کچلے گی اور تو اس کی ایڑی کی تاک میں رہے گا۔

(تکوین ب ۳: ۱۴، ۱۵، ۱۶)

عورت کو یہ سزا ملی کہ "میں تیرے درد حمل کو بڑھاؤں گا۔ تو درد ہی کے ساتھ اولاد جنے گی۔ تو اپنے شوہر کے اختیار میں رہے گی۔ تجھ پر وہ حکومت کرے گا۔"

(تکوین ۳: ۱۶)

مرد کو یہ سزا دی گئی کہ "زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ محنت کے ساتھ تو اپنی زندگی کے تمام ایام اس سے کھائے گا۔ اور کھیت کی نباتات تیری خوراک ہوں گی۔ تو اپنے منہ کے پسینے سے روٹی کھائے گا۔

(تکوین ب ۳: ۱۷)

۱۳۔ آدم اور حوا خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ ایمان باللہ سے ان کا گناہ معاف نہیں ہوا تو مسیح کی صلیب پر ایمان گناہ کا کفارہ کیسے بن سکتا ہے۔

۱۴۔ ایک گناہ صلیب کے بغیر معاف نہیں ہو سکتا تو کئی گناہ محض اقرار سے پادری کیسے معاف کر دیتا ہے۔

۱۵۔ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے اور بپتسمہ سے پہلے مر جاتا ہے وہ اپنی مسخ شدہ فطرت کی وجہ سے سزا کا مستحق ہے۔

۱۶۔ مسیح کی صلیب سے پہلے جتنے لوگ تھے۔ خواہ انبیاء خواہ اولیاء (نعوذ باللہ) جہنم کے مستحق ہیں۔ اور شاید اسی لئے ان سے گناہ بھی سرزد ہوتے رہے۔ اگر وہ مسیح کی صلیبی موت پر یقین رکھتے تو ان کی فطرت بدل جاتی اور خدائی فطرت کی وجہ سے وہ گناہ نہ کرتے جیسا کہ آج پوپ' پادری اور مذہبی رہنما مسیح پر ایمان کی وجہ سے راستباز ہیں۔

آپ اس عقیدہ کے بارے میں جتنا سوچتے جائیں گے اتنا اس قدر اس کا بطلان واضح ہوتا جائے گا۔ اسی لئے قدیم و جدید کئی علماء محققین اس نظریے کو نہیں مانتے۔

یہ عقیدہ انسانیت کے لئے بہت ہی خطرناک ہے۔ مسیحی دنیا میں گناہ کی ہولناکی کا احساس بالکل ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ جب ایک شخص کو یقین ہے کہ راستبازی اور شریعت کی پابندی اسے نجات نہیں دے سکتی تو خواہ مخواہ اپنی ذات پر پابندیاں کیوں عائد کرے۔ اسے کیا پڑی ہے کہ وہ اپنا آرام و آسائش قربان کرے۔ شاید راہب اور عبادت گزار پاگل ہیں جو اپنے آرام کو بھول جاتے ہیں اور سخت ریاضتیں کرتے ہیں جب نجات

"صلیب پر ایمان" پر منحصر ہے۔ تو ایک عام ایماندار اور ایک راہب میں کیا فرق ہے۔ دونوں نجات یافتہ ہیں۔

یقین کیجئے یورپ کی ترقی اور معاملات میں ان لوگوں کا اچھا رویہ مسیحی تعلیمات سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ انسانیت کے ساتھ سچی محبت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انسان کی فطرت مسخ نہیں ہوئی ورنہ غیر عیسائی اور خصوصاً مغرب کے دھریے معاملات میں اتنی راستبازی کا مظاہرہ نہ کرتے اور اس کے برعکس پادری صاحبان اور پوپ زنا کے جرم میں ملوث نہ پائے جاتے۔ یسوع علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بچا کر اپنا وعدہ پورا کیا کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے فرمودات میں ہمیشہ یہی تعلیم دی کہ نجات ایمان باللہ اور تقویٰ و پرہیزگاری میں ہے۔ آپ علیہ السلام نے تو یہ فرمایا کہ "میں تجھ سے کہتا ہوں کہ جب تک تو کوڑی کوڑی ادا نہ کرے گا۔ وہاں سے ہرگز نہ چھوٹے گا۔"

(لوقا ۱۲: ۵۹)

مسیح علیہ السلام نے اپنی پیروی کی تلقین فرمائی اور اسے ذریعہ نجات قرار دیا۔ فرمایا۔ "دنیا کا نور میں ہوں۔ جو میری پیروی کرے گا وہ تاریکی میں نہیں چلے گا بلکہ زندگی کا نور پائے گا"

(یوحنا ب ۸: ۱۲)

ان تصریحات سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ حضرت مسیح کی صلیب اور کفارہ کا عقیدہ پادریوں کا وضع کردہ ہے۔ اناجیل اربعہ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی تعلیمات میں ان عقائد کی طرف اشارہ تک نہیں کیا جنہیں آج عیسائی دنیا مذہب کی بنیاد قرار دے رہی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی

تعلیمات کا ایک مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اناجیل اربعہ غیر مستند ہیں لیکن سچائی اور خدائی آواز ظلمت کے پردوں میں ہرگز نہیں چھپ سکتی۔ تحریف کے باوجود بھی اناجیل میں مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کا عکس نمایاں ہے۔ اگر قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں اناجیل میں حق کی تلاش کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آج بھی کافی تعلیمات معنوی روایت کے رنگ میں موجود ہیں۔ افسوس کہ پادری حضرات ان تعلیمات کو بھی معنوی تحریف کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی حقیقی تعلیمات

توحید باری تعالیٰ:

اللہ ایک ہے صرف وہی واجب الوجود ہستی ہے۔ اس کی صفات قدیم ہیں۔ ایک اس ذات کے علاوہ باقی تمام حادث ہیں۔ مخلوق خداوندی ہے اللہ کا محتاج ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور روح القدس اللہ کی مخلوق ہیں۔ حادث ہیں اور اللہ کے محتاج ہیں۔ اگرچہ ان کی شان بہت بلند ہے۔

قرآن کریم میں جس قدر توحید باری کو بیان کیا گیا ہے اس قدر کسی اور مضمون کو بیان نہیں کیا گیا۔ صرف سورۃ اخلاص لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا محور و مرکز بھی توحید باری تعالیٰ رہا ہے۔ اناجیل میں اب تک یہ تعلیم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ چند آیات پیش خدمت کرتا ہوں۔

۱۔ متی بیان کرتا ہے کہ جب شیطان نے آپ علیہ السلام سے کہا کہ اگر تو سجدہ کرلے تو دنیا کی تمام سلطنتیں تیری ملکیت کردوں تو آپ علیہ السلام نے تورات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ۔

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر"

(متی ب ۴: ۱۰)

اس آیت کریمہ میں توحید باری تعالیٰ' صرف اسی کے مستحق عبادت ہونے اور مسیح علیہ السلام کی عبدیت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ اپنے شاگردوں کو توحید کا درس دیتے ہوئے فرمایا "اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمان میں ہے۔"

(متی ب ۲۳: ۹)

آیت کریمہ میں باپ خالق کے معنی میں ہوا۔ یقیناً مسیحی حضرات کے نزدیک بھی یہاں حقیقی باپ مراد نہیں ہو سکتا۔ گویا آپ علیہ السلام بیان فرما رہے ہیں۔ کہ خالق ایک ہی ہے جو آسمان میں ہے۔ عظمت و کبریائی کو ظاہر کرنے کے لئے آسمان کا لفظ استعمال ہوا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ موجود ہے۔

۳۔ لوقا نے اللہ تعالیٰ کی سبوحیت کو مسیح علیہ السلام کی زبان میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا"

(لوقا ب ۱۸: ۱۹)

اس آیت میں مسیح علیہ السلام کا مخاطب ایک سردار ہے جس نے

آپ کو نیک (ہر کمزوری سے پاک غیر محتاج) کہا۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ سیوح تو صرف ایک ذات ہے اور میں ذات و صفات باری میں ہرگز شریک نہیں ہوں۔ لہٰذا تم ایسا کفریہ کلمہ زبان سے مت نکالو۔

۴۔ ایک فقیہ کو آپ نے بتایا کہ احکام خداوندی میں سے پہلا حکم یہ ہے کہ "خداوند ہمارا خدا ایک ہے خداوند ہے۔ پس تو خدا اپنے خدا کو سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے پیار کر۔"

(مرقس ب ۱۲:۲۹)

اگر آپ علیہ السلام (نعوذ باللہ خدا ہوتے تو ایک فقیہ پر یہ عیاں کرتے کہ عہد قدیم (تورات) کی یہ آیت میری طرف اشارہ کرتی ہے لیکن آپ علیہ السلام نے توحید باری کو بیان کیا۔ بلکہ آپ نے جگہ جگہ اپنے انسان محض اور رسول ہونے کا اقرار کیا ہے۔ اور کہیں بھی اپنی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا

۵۔ میں اپنی عزت نہیں چاہتا۔ ایک ہے جو چاہتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے"

(یوحنا ب ۸: ۵۰)

۶۔ "خدا ایک ہے اور خدا اور انسان کے بیچ میں درمیانی بھی ایک یعنی مسیح یسوع جو انسان ہے"

(۱۔ تیمتھیس ۲: ۵)

مسیح علیہ السلام نے دعا کرتے ہوئے عرض کی۔

"ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ اکیلے سچے خدا کو اور تیرے بھیجے ہوئے یسوع مسیح کو جانیں"

(یوحنا باب ۱۷: ۳)

اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ آدم اور حوا سے خطا سرزد ہوئی اور نہ توانہوں نے توبہ کی اور نہ خدا نے انہیں معاف کیا تو تب بھی اس کا گناہ منتقل ہونا کیسے باور کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ والدین کے اوصاف اور کمزوریاں ان کی اولاد میں منتقل ہوتی ہیں اس سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ بھی تو یقینی ہے کہ صرف اچھائیاں بھی منتقل ہوتی ہیں۔ اگر اچھائی منتقل ہوتی ہیں۔ تو نوح کی اولاد کو نبوت منتقل ہوتی اور اس طرح پوری نسل انسانی نبی ہوتی

۲۔ مسیح علیہ السلام حضرت مریم کے بطن مبارک سے تولد ہوئے ہیں اور مریم نسل آدم سے ہونے کی وجہ سے معصوم عن الخطا نہیں ہیں۔ لہٰذا والدہ کی اس خطا کے وصف کو مسیح میں منتقل ہونا ضروری ہے۔ اگر گناہ کی منتقلی یقینی تسلیم کی جائے تو نعوذ باللہ خدا خود راستباز نہیں ٹھہرتا کیونکہ مسیح عیسائیوں کے نزدیک مکمل خدا ہے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ مسیح مکمل انسان بھی ہے تو انسان ہونے کے ناطے ان میں گناہ ہونا ضروری ہے۔ مسیح کی خدائی پاک ٹھہرتی ہے لیکن اس کی انسانیت تو گناہ آلودہ ہی ٹھہرتی ہے۔

۳۔ اور یہ بھی آپ کا عقیدہ ہے کہ مسیح کی انسانیت کو صلیب دی گئی ہے۔ خدائی کو نہیں تو گویا گناہ کا کفارہ بھی گناہ گار فطرت دی گئی ہے۔ جو شیطان کو ہرگز قبول نہیں تھی۔ اس طرح انسان گناہ سے ابھی تک نہیں چھوٹا۔ گناہ کا بدستور غلام ہے۔

مسیح علیہ السلام کس صفائی سے توحید باری تعالیٰ اور اپنی رسالت کی تصریح کر رہے ہیں۔ اس واضح تعلیم کے باوجود بھی شرک کی راہ اختیار کرنا تعصب اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔

آپ علیہ السلام نے خدائے واحد' اکیلا خدا اور ایک خدا کی اصطلاحات کو استعمال کیا ہے۔ اگر اپنی خدائی کا بیان مقصود ہوتا تو کہیں تو فرماتے کہ میں بھی خدا ہوں لیکن انسانی شکل میں تمہیں پھانسی پاکر نجات دینے آیا ہوں۔ لیکن آپ نے کبھی بھی یہ تعلیم نہیں دی۔ یہ تمام تعلیمات مختلف کونسلوں کی وضع کردہ ہیں۔ آپ نے تو ہمیشہ یہی فرمایا۔

۷۔ خدائے واحد...... کو جانیں۔

(یوحنا ۱۷: ۳)

۸۔ وہ عزت جو خدائے واحد کی طرف سے

(یوحنا ب ۵: ۴۴)

رسالت مسیح علیہ السلام:

ہمارا عقیدہ ہے کہ مسیح علیہ السلام ایک رسول ہیں جنہیں صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا گیا۔ قرآن کریم نے آپ کی زبانی اس کی تصریح فرمادی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا○ وَ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا○ وَ بَرًّاۢ بِوَالِدَتِیْ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا○ وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا○ ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ○ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ○ وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ○ فَاخْتَلَفَ

الْاَحْزَابُ مِنْ بَیْنِہِمْ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ مَّشْہَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ○

ترجمہ:۔ اس نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔ اور اسی نے مجھے بابرکت کیا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں اور اسی نے مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوۃ دینے کا جب تک میں زندہ رہوں اور مجھے خدمت گزار بنایا اپنی والدہ کا۔ اور اس نے نہیں بنایا مجھے جابر (اور) بدبخت۔ اور سلامتی ہو مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا۔ اور جس دن مجھے اٹھایا جائے گا۔ زندہ کرکے۔ یہ ہے عیسیٰ بن مریم (اور یہ ہے وہ) سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے وہ پاک ہے جب وہ فیصلہ فرما دیتا ہے۔ کسی کا کام تو بس وہ صرف اتنا حکم دیتا ہے۔ اس کے لئے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے۔ اور تمہارا بھی سو اسی کی عبادت کیا کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ پھر کئی گروہ آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ پس ہلاکت ہے کفار کے لئے اس دن کی حاضری سے جو بہت بڑا ہے۔

(مریم ۲۹ تا ۳۷)

اناجیل اربعہ میں آپ کی رسالت کی تصریح ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

ا۔ "اور جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔"

(یوحنا ۱۴: ۲۴)

آپ علیہ السلام نے تصریح فرما دی ہے کہ میں خود نہیں آیا بلکہ

بھیجا گیا ہوں۔ جو کلام آپ تک پہنچتا ہے۔ یہ میرا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اگر آپ خود خدا ہوتے۔ یا مجسم کلام ہوتے تو فرماتے میں مجسم کلام ہوں۔ میں خود خدا ہوں نہ کہ خدا کا فرستادہ۔ اگر مسیح ہی خدا ہیں تو پھر حکم کیوں بجالا رہے ہیں۔ جب برابر ہیں تو اپنے آپ کو چھوٹا اور خدا کو بڑا کیوں کہہ رہے ہیں۔ اگر جوہر میں برابری ہے تو واضح فرما دیتے۔ لیکن آپ نے یہ کہیں بھی نہیں فرمایا کہ میں خدا کے برابر ہوں بلکہ فرمایا۔

۲۔ میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کر سکتا جیسے میں سنتا ہوں ویسے ہی عدالت کرتا ہوں۔ اور میری عدالت راست ہے۔ کیونکہ میں اپنی مرضی کو نہیں بلکہ اس کی مرضی کو جس نے مجھے بھیجا ہے چاہتا ہوں۔

(یوحنا ب ۵: ۳۰)

مسیح کی مرضی اور خدا کی مرضی میں فرق ہے۔ مسیح تو یہ چاہتے تھے کہ تمام بنی اسرائیل ایمان لائیں۔ لیکن مشیئت الٰہی کو یہ منظور نہ تھا۔ مسیح کی مرضی خدا کی مرضی کے تابع تھی۔ اسی لئے تو وہ فرماتے تھے کہ میں اپنی نہیں بلکہ بھیجنے والے اکیلے خدا کی مرضی چاہتا ہوں۔ کس قدر خوبصورتی سے اپنی نبوت کی تصریح فرما دی ہے۔ بلکہ آیت کے شروع میں وضاحت کر دی کہ قادر مطلق صرف ایک ہے۔ میں تو صرف اس کا حکم بجا لاتا ہوں اور اپنے آپ سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

۴۔ گناہ کی سزا ابدی موت ہے جیسا کہ مسیحی عقائد میں درج ہے۔ اسی لئے گناہ کے کا کفارہ بھی ایسی موت بن سکتی ہے۔ جو ابدی ہو مسیح علیہ السلام کی موت مسیحی عقائد کے مطابق ابدی نہیں بلکہ عارضی ہے لہٰذا یہ عدل پر مبنی کفارہ نہیں بن سکتی۔

۵۔ سب سے پہلا گناہ آدم اور حوا نے کیا۔ اگر یہ گناہ نہ کرتے

توان کی نسل گناہ میں مبتلا نہ ہوتی۔ گویا اصل میں گناہ گار تو صرف آدم اور حواء ہیں۔ ان کی اولاد کو تو گناہ وراثت میں ملا ہے۔ اور اس گناہ میں آدم کی مرضی شامل نہیں۔ اگر انسان چاہے بھی تو گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ جس طرح کہ انسان شکل وصورت اور رنگ ونسل کی تبدیلی پر قادر نہیں ہے۔ اس وجہ سے عدل خداوندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ اصل مجرم کو سزا دے۔ ان کو ہرگز سزا نہ دے جو بیچارے مفت میں پھنس گئے ہیں۔

۶۔ آج اگر کوئی شخص جرم کرتا ہے۔ اور صرف (Sorry) کہہ دیتا ہے۔ تو اس کا جرم معاف کر دیا جاتا ہے۔ اور اسے عدل کے خلاف نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے انسانیت کی معراج خیال کیا جاتا ہے۔ اگر معاف کر دینا عدل کے خلاف ہوتا تو سچا مذہب اس بے انصافی سے ضرور روکتا جبکہ مسیح کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے دشمن کو بھی معاف کرو۔ خدانخواستہ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ خداوند یسوع مسیح کا یہ حکم بے انصافی پر مبنی ہے۔

عدل کا تقاضا تو یہ ہے کہ جو گناہ کرے وہ قانون کے مطابق سزا پائے سزا میں تخفیف بے انصافی ہوگی۔ آدم اور حوا نے گناہ کیا۔ اور گناہ کی سزا ابدی موت ہے۔ لہٰذا سزا دونوں اصل مجرموں کو ملتی اور اس طرح آدم و حوا کی جڑ کاٹ دی جاتی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ پچھتانے سے بھی بچ جاتا۔ آپ نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا

۳۔ "کیونکہ ابن انسان اس لئے آیا ہے کہ کھوئے ہوئے کو ڈھونڈے اور بچائے۔"

(لوقا ب ۱۹: ۱۰)

مسیح علیہ السلام نے ایمان بالرسالت کی تلقین کی اور فرمایا

۴۔ "تم اس پر ایمان لاؤ جسے اس نے بھیجا ہے"

(یوحنا ٦:٢٩)

یعنی میں خدا نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ ہوں۔ اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کی تعلیمات پر عمل بھی کرو جنہیں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری ھدایت کے لئے لے کر مبعوث ہوا ہوں۔ فرمایا

۵۔ میری تعلیم میری نہیں۔ بلکہ اس کی ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر کوئی اس کی مرضی پر چلنا چاہے تو جان لے گا کہ یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے یا کہ میں اپنے آپ سے بولتا ہوں۔ جو اپنی طرف سے بولتا ہے وہ اپنی عزت چاہتا ہے۔ لیکن جو اپنے بھیجنے والے کی عزت چاہتا ہے لیکن جو اپنے بھیجنے والے کی عزت چاہتا ہے۔ وہ راست ہے اور اس میں ناراستی نہیں ہے۔

(یوحنا ٧:١٦ تا ١٨)

آپ علیہ السلام نے ہیکل میں تعلیم دیتے ہوئے فرمایا۔

"تم مجھے جانتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ کہاں کا ہوں اور میں آپ سے نہیں آیا مگر جس نے مجھے بھیجا ہے وہ برحق ہے اس کو تم نہیں جانتے میں اسے جانتا ہوں اس لئے کہ میں اس کی طرف سے ہوں اور اس نے مجھے بھیجا ہے۔"

(یوحنا ٧:٢٨، ٢٩)

آپ نے تصریح فرمادی کہ میں خدا نہیں بلکہ انسان ہوں جس نے تمہارے سامنے گلیل کے ناصرت میں مریم کے بیٹے کی حیثیت سے تیس سال زندگی بسر کی ہے تمہیں میری نبوت پر اعتراض ہے۔ لیکن یاد رکھو یہ تعلیمات اور منصب رسالت مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ ذات باری تعالیٰ اور اپنے کلام کی تبلیغ کے لئے کسی انسان کا انتخاب ان تمام حقائق سے

م ناواقف ہو۔ لیکن میں نبی ہونے کے ناطے ان کو جانتا ہوں اور میرا فرض منصبی ہے کہ تمہیں آگاہ کروں۔ آپ نے تصریح کی میں تو محض رسول ہوں۔ ہرگز خدا نہیں یہ کلام معجزہ نما اللہ کا ہے میرا نہیں تو صرف فرستادہ الٰہی ہوں فرمایا

۶۔ اور میں آپ سے کچھ نہیں کرتا مگر جیسا باپ نے مجھے سکھایا ویسے ہی یہ باتیں کہتا ہوں۔ اور جس نے مجھے بھیجا ہے وہ میرے ساتھ ہے اور اس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا کیونکہ میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اسے پسند آتے ہیں۔

(یوحنا ۸: ۲۸ تا ۲۹)

"میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اسے پسند آتے ہیں۔" یعنی میں اللہ کے حکم کی بجا آوری کرتا ہوں۔ اس کی عبادت کرتا ہوں کیونکہ انسان ہوں۔ اور اس کا کلام تمہیں سناتا ہوں کیونکہ اللہ کا رسول ہوں۔ اور جو اللہ کی مرضی بجالائے وہ اکیلا نہیں ہوتا کہ دنیا اسے صلیب دے دے اور وہ پکارتا ہے۔ الٰہی! الٰہی! تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ جسے چھوڑ دیا گیا ہے اور دشمن حق نے اسے پھانسی دے دی۔ وہ مردود غدار یہودہ تھا نہ کہ مسیح۔ کیونکہ مسیح تو قیامت تک ہمارے ساتھ ہے۔ علیہ و علی نبینا افضل الصلوۃ والتسلیم۔ انجیل یوحنا میں مسیح علیہ السلام کی رسالت کی تصریح ان الفاظ میں ملتی ہے۔

۷۔ "میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا بلکہ باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اسی نے مجھے حکم دیا کہ کیا کہوں اور کیا بولوں۔ اور میں جانتا ہوں کہ اس کا حکم ہمیشہ کی زندگی ہے۔ پس جو کچھ میں کہتا ہوں جس طرح باپ نے مجھے کہا ہے اسی طرح کہتا ہوں۔"

(یوحنا ب ۱۲: ۴۹ '۵۰)

ایک جگہ آپ نے اپنے لئے مرشد کے لفظ کو استعمال کیا ہے فرمایا

۸۔ "تمہارا مرشد ایک ہی ہے۔ یعنی المسیح"

(متی ب ۲۳: ۱۱)

اپنی اطاعت کو اطاعت خداوندی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

۹۔ "اور جو مجھے قبول کرے وہ اس کو جس نے بھیجا ہے قبول کرتا ہے۔

(لوقا۹: ۴۸)

اسی طرح آپ نے مزید فرمایا

۱۰۔ "جو مجھے ناچیز جانتا ہے وہ اسے ناچیز جانتا ہے۔ جس نے مجھے بھیجا ہے"

مسیح علیہ السلام نے معجزات کو اپنی رسالت کی دلیل قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں

۱۱۔ یہی کام...... میری گواہی دیتے ہیں کہ باپ نے مجھے بھیجا ہے"

(یوحنا۵: ۳۶)

قارئین یاد رہے کہ مسیحی علماء حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کو ان کی الوہیت کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ جبکہ مسیح علیہ السلام خود تصریح فرما رہے ہیں۔ کہ معجزات آپ کی رسالت کی دلیل ہیں نہ کہ الوہیت کی۔

۱۲۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انجیل برنباس کا اس سلسلے میں ایک اقتباس پیش کر دیا جائے۔

"یقین جانو' جب خدا نے مجھے اسرائیل کے گھرانے کی طرف

بھیجنے کو چنا تو اس نے مجھے شفاف آئینے کی مانند ایک کتاب دی۔ جو میرے دل میں اس طرح اتر گئی کہ جو کچھ میں بولتا ہوں اسی کتاب سے نکلتا ہے۔ اور جب وہ کتاب میرے منہ سے نکلنا بند ہو جائے گی تو میں دنیا سے اٹھا لیا جاؤں گا۔"

(ص ۲۳۲۔ اسلامک پبلیکیشنز لاہور)

ابن انسان

مسیح علیہ السلام ایک انسان تھے۔ وہ کنواری مریم علیہا السلام کے بطن مبارک سے بن باپ پیدا ہوئے۔ ایک انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ تمام عوارض انسانی آپ کو لاحق ہوتے رہے۔ آپ کو تیس سال کی عمر میں پیغام حق کی تبلیغ کا حکم دیا گیا۔ آپ نے توحید باری تعالیٰ کی تعلیم کو زوردار انداز میں پیش کیا۔ اور اپنی رسالت کی تصریح کے ساتھ ساتھ اپنی عبدیت کو آشکار کیا۔ آپ نے فرمایا

۱۔ "جو کوئی آدمیوں کے آگے میرا اقرار کرے ابن انسان بھی خدا کے فرشتوں کے آگے اس کا اقرار کرے گا۔"

(لوقا ب ۱۲: ۸)

۲۔ کیونکہ ابن انسان اس لئے آیا ہے۔ کہ کھوئے ہوئے کو ڈھونڈے اور بچائے۔

(لوقا ب ۱۹: ۱۰)

۳۔ "پھر اس نے ان سے کہا کہ ابن انسان سبت کا بھی مالک ہے"

(لوقا ب ۶: ۵)

یعنی اللہ تعالٰی نے ایام کو انسان کے لئے بنایا ہے نہ کہ انسان کو ایام کی خاطر۔ آپ نے یہ جملہ اس وقت کہا جب فرنسیوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ تیرے شاگرد جب بھوکے ہوتے ہیں تو کھیتوں سے بالیں توڑ کر ہاتھوں پر ملتے ہیں۔ اور کھا لیتے ہیں حالانکہ سبت کو ایسا کرنا روا نہیں۔ آپ نے عہد قدیم کی معنوی تحریف کی بھی تصریح کر دی اور سبت کی بے جا پابندیوں کی بھی نشاندہی کر دی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں خدا نہیں کہ شریعت کی پابندی نہ کروں بلکہ ابن انسان ہوں اور شریعت انسان کے لئے ہے۔ نہ کہ انسان بے جا پابندیوں کے لئے تخلیق ہوا ہے۔

ایک جگہ آپ فرماتے ہیں غنی تو صرف خدائے لم یزل ہے۔ میرا اختیار ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے۔ فرمایا

۴۔ "اور اسے اختیار بھی بخشا کہ عدالت کرے اس لئے کہ وہ ابن انسان ہے"

(یوحنا۱:۵۱)

حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک مادر زاد اندھے کو شفاء بخشی۔ علماء شرع نے اسے معجزہ کی تشہیر سے روکا لیکن جب وہ شخص نہ مانا تو اسے باہر نکال دیا گیا۔ اور وہ مسیح علیہ السلام کو ڈھونڈھنے لگا۔ ملاقات پر آپ علیہ السلام نے اسے دعوت دی۔ "کیا تو ابن انسان پر ایمان لاتا ہے"

(یوحناب۹:۳۵)

وہ شخص مسیح علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لایا اور سجدہ تعظیمی بجالایا۔ ایک جگہ آپ علیہ السلام اپنے رفع آسمانی کی خبر دیتے ہوئے ابن انسان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تاکہ یہ معجزہ دیکھ کر لوگ انہیں خدا نہ کہنا شروع کر دیں۔ آپ نے فرمایا "تم ابن انسان کو اوپر جاتے ہوئے

دیکھو گے"۔

(یوحنا ب ۶: ۶۲)

۶۔ آپ نے انجیل کی تعلیم کو ابدی خوراک قرار دیا اور اس کے حصول کی تعلیم دی فرمایا "فانی خوراک کے لئے نہیں بلکہ اس خوراک کے لئے محنت کرو جو ہمیشہ زندگی تک ٹھہرتی ہے جسے ابن انسان تمہیں دے گا"

(یوحنا ب ۶: ۲۷)

۷۔ رہنے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا "ابن انسان کے لئے جگہ نہیں جہاں اپنا سر بھی رکھے"۔

(متی ب ۸: ۲۰)

اپنے آپ کو ایک اچھے بیج بونے والے سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ میں ابن انسان ہوں خدا یا خدا کا بیٹا نہیں ہوں۔ "اچھا بیج بونے والا ابن انسان ہے"

(متی ۱۳: ۳۷)

ابن انسان کی اصطلاح کے استعمال سے مقصود یہ تھا کہ ان تعلیمات اور معجزات کو دیکھ کر لوگ مجھے خدا نہ کہنا شروع کر دیں۔ عجیب بات ہے ان تصریحات کے باوجود مسیحی آپ کو خدا ماننے پر مصر ہیں۔

اعتراض

مسیح نے اناجیل کی کئی آیات میں اپنے آپ کو خدا کہا ہے۔ اگر آپ محض انسان ہوتے تو اپنے آپ کو خدا ہرگز نہ کہتے۔ جن آیات میں آپ نے ابن انسان کہا ہے وہ ظاہری حوالے سے ہے حقیقت میں تو آپ

خدا ہیں۔

جواب

بائبل میں مسیح علیہ السلام کو خدا یا خداوند نہیں کہا گیا۔ بلکہ بہت سے دوسرے افراد کو بھی خدا کہا گیا ہے۔ اس لئے اگر خدا یا خداوند سے الوہیت ثابت کریں تو لازم آئے گا کہ

۱۔ بے انصاف منصف الہ ہیں۔ کیونکہ بائبل میں اسے خدا کہا گیا ہے "میں نے کہا کہ تم خدا ہو تم تمام حق تعالیٰ کے فرزند ہو۔"

(مزمور ۸۱:۶)

۲۔ فرشتہ جبرائیل الہ ہے کیونکہ بائبل میں اسے خدا کہا گیا ہے۔

جب ابرام ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر مطلق ہوں....."

(تکوین ب ۱۷:۱)

علمائے مفسرین مجبوراً یہاں خداوند سے فرشتہ مراد لیتے ہیں کیونکہ عہد جدید کی رو سے "خدا کو بھی کسی نے نہیں دیکھا" ہے۔

اگر خدا کے لفظ سے الوہیت ثابت کریں تو لازم آئے گا کہ شیطان بھی الہ ہے کیونکہ عہد جدید نے اسے خدا کہا ہے۔

"اور اگر ہماری خوشخبری پر پردہ پڑا ہے تو ہلاک ہونے والے کے واسطے ہی پڑا ہے۔ یعنی ان بے ایمانوں کے واسطے جن کی عقلوں کو اس جہان کے خدا نے اندھا کر دیا ہے تاکہ مسیح جو خدا کی صورت ہے اس کے جلال کی خوشخبری کی روشنی ان پر نہ پڑے۔"

(۲ قرنتیوں ب ۴: ۳، ۴)

چوتھی آیت میں جہاں خدا سے مراد شیطان ہے۔ علماء پروٹیسٹنٹ کے نزدیک اس لفظ کا یہی مفہوم ہے کیونکہ اگر "اس جہان کے خدا" سے مراد اللہ تعالیٰ لیں تو اخفاء حق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جو صحیح نہیں۔ بہر حال لفظ خدا یا خداوند بائیبل میں غیر الہ کے لئے کثرت سے استعمال ہوا ہے۔

اعتراض

مسیح نے اپنی الوھیت کو لفظ ابن خدا سے بیان کیا ہے اصطلاح سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند مسیح اللہ تعالیٰ کا اقنوم ثانی ہے

جواب

لفظ ابن خدا بھی دوسروں کے لئے کثرت سے استعمال ہوا ہے اس لئے اس لفظ سے بھی مسیح علیہ السلام کی الوہیت ثابت نہیں ہوتی۔

۱۔ اھل ایمان کو خدا کا فرزند کہا گیا ہے "جتنے خدا کے روح کی ہدایت سے چلتے ہیں وہی خدا کے فرزند ہیں۔"

(رومیوں ب ۸: ۱۴)

۲۔ "ہمارا باپ ایک ہے یعنی خدا"

(یوحنا ۸: ۴۱)

۳۔ میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم میرا پہلوٹھا ہے

(ارمیا ۳۱: ۹)

۴۔ کیا افرائیم میرا پیارا عزیز فرزند نہیں ہے۔

(ارمیاء ۳۱: ۱۹)

۵۔ تیری غیرت اور تیری طاقت اور دلی ہمدردی اور تیری

رحمتیں کہاں ہیں؟ ان کو روک نہ رکھ کیونکہ تو ہمارا باپ ہے"

اعتراض

(اشعیاء ب ۶۳: ۱۵، ۱۶)

مسیح علیہ السلام نے اپنے لئے صرف یہی الفاظ استعمال نہیں کئے بلکہ فرمایا کہ میں خدا سے پیدا ہوا ہوں۔ یعنی مسیح جو ہر الوہیت کا دوسرا اقنوم ہے۔

جواب:

مسیح علیہ السلام نے یہ لفظ صرف اپنے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ دوسروں کے لئے بھی کیا۔ اگر اس سے الوھیت ثابت کریں تو پھر مسیح علیہ السلام کے علاوہ کئی دوسرے افراد کو الہ ماننا پڑے گا

چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

۱۔ یوحنا اپنے ایک خط میں محبت کرنے والوں کو خدا سے پیدا ہونے والا قرار دیتا ہے۔ "اے پیارو! آؤ ہم ایک دوسرے سے محبت رکھیں کیونکہ محبت خدا سے ہے جو محبت رکھتا ہے۔ وہ خدا سے پیدا ہوا ہے اور خدا کو پہچانتا ہے۔" (ا۔ یوحنا ۴: ۷)

۲۔ اسی خط میں یسوع کو المسیح ماننے والے کو یوحنا "خدا سے پیدا شدہ" کہتا ہے۔ جو کوئی ایمان لاتا ہے کہ یسوع ہی المسیح ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے

(ا۔ یوحنا ب ۵: ۱)

۳۔ یوحنا مسیح کے شاگردوں کو باور کرتا ہے کہ دنیا پر غلبہ اور فتح کا سبب مسیح پر ایمان ہے۔ اور یہی فتح ظاہر کرتی ہے کہ فاتح خدا سے پیدا ہوا۔ کیونکہ جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے وہ دنیا پر غالب آتا ہے۔ اور فتح

سے ہم دنیا پر غالب آگئے ہیں وہ ہمارا ایمان ہے

(ا۔ یوحنا ۵: ۴)

۴۔ یوحنا کے نزدیک جو شخص راستبازی کی زندگی بسر کرتا ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے۔ "ہم جانتے ہیں کہ جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا"

(یوحنا ب ۵: ۱۸)

اس سے اگلی آیت میں یوحنا تصریح کرتا ہے کہ ہم راستباز ہیں کیونکہ ہم خدا سے پیدا ہوئے ہیں ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ بائبل نے "خدا سے پیدا شدہ" کے الفاظ غیر مسیح کے لئے کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ نیز یوحنا حواری کے خطوط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لفظ خدا' ابن خدا اور خدا سے پیدا شدہ کی اصطلاحات سے مسیح علیہ السلام کے شاگرد الوہیت ثابت نہیں کرتے تھے۔ یہ کونسلیں ہیں جنہوں نے اس عقیدہ کو گھڑا اور پھر ایسی تمام آیات کو کام میں لایا گیا جن سے بذریعہ غلط تاویل یہ عقیدہ ثابت ہو سکتا تھا۔

اعتراض

مسیح علیہ السلام نے اپنی الوہیت کو کئی الفاظ سے بیان کیا ہے۔ آپ نے یہ بھی تو فرمایا ہے کہ میں اور باپ ایک ہیں۔ یعنی ہمارا جوہر ایک ہے لیکن شخصیات الگ الگ ہیں۔

جواب

مسیح علیہ السلام نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ ہمارا جوہر ایک ہے اور

شخصیات الگ الگ ہیں۔ اگر بائبل میں کہیں بھی یہ الفاظ ہیں تو دکھایئے بات ہی ختم ہو جائے گی۔ ہاں مسیح علیہ السلام نے شاید یہ فرمایا ہو کہ میں اور باپ ایک ہیں۔ لیکن یہ مسیحیت کے اس اتحاد کو تو ظاہر نہیں کرتا جس سے مسیح علیہ السلام کبھی خدا بن جاتے ہیں۔ اور کبھی ایک مجبور و مقہور انسان۔ "میں اور باپ ایک ہیں" یا باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں ہوں تو مسیح علیہ السلام کی کمال اطاعت کو ظاہر کرتا ہے کہ میں صرف وہی کام کرتا ہوں جس سے وہ خوش ہوتا ہے جب ارادوں میں تباین اور تخالف نہیں تو گویا مسیح اور خدا ایک ہیں اور مسیح خدا میں ہے اور خدا مسیح میں ہے۔ ہم اس لئے ان الفاظ کو اس مفہوم پر محمول کرتے ہیں اور اس سے مسیح علیہ السلام کی الوہیت کو ثابت نہیں کرتے کیونکہ یہی الفاظ غیر مسیح کے لئے بھی آئے ہیں۔ اگر اس سے الوہیت ثابت کریں تو پھر ہر مومن الہ ٹھہرے گا۔ کیونکہ انجیل میں وہی الفاظ مومنین کے لئے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یوحنا اپنی انجیل میں لکھتا ہے۔

"جو کوئی اقرار کرے کہ یسوع خدا کا بیٹا ہے خدا اس میں اور وہ خدا میں رہتا ہے"

(یوحنا ب ۴: ۱۵)

اسی طرح یوحنا نے اپنے پہلے خط میں اسی ترکیب کو مومنین کے لئے استعمال کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

"اور ہم ایک دوسرے سے محبت رکھیں تو خدا ہم میں رہتا ہے"

(۱۔ یوحنا ب ۴: ۱۲)

اسی خط میں یوحنا ان الفاظ کا اطلاق اپنے مخاطبین پر کرتا ہے اور اس کا معنیٰ بھی متعین کر دیتا ہے۔

"اور ہماری وہ محبت جو اس سے ہم میں کامل ہو گئی ہے ہم اسی سے جانتے ہیں کہ ہم اس میں رہتے ہیں اور وہ ہم میں کیونکہ اس نے اپنی روح میں سے ہمیں دیا ہے"

(ا۔ یوحنا ۴: ۱۳)

اسی باب کی سترھویں آیت میں اسی ترکیب کو ایک دفعہ پھر دھرایا گیا ہے۔

"خدا محبت ہے اور جو محبت میں رہتا ہے وہ خدا میں رہتا ہے اور خدا اس میں" (۴: ۱۷)

ان تمام تصریحات کے باوجود بھی اگر اتحاد سے الوھیت ثابت کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے تو اس ہٹ دھرمی کا علاج ناممکن ہے۔ ان آیات سے ایک اور بات بھی سامنے آتی ہے کہ الوھیت مسیح کا عقیدہ بعد کے کسی دور کی پیداوار ہے۔ مصنفین کے ذھن میں دور دور تک ایسی کوئی بات نہیں تھی ورنہ وہ اس بنیادی عقیدے کو مبہم نہ چھوڑتے کیونکہ انہیں تو اپنے تجربے اور اسلوب کے استعمال کرنے میں مکمل آزادی تھی۔ چاروں مصنفین اور حواریوں نے اپنی تحریروں میں اس موضوع کو واضح نہیں کیا۔ لگتا ہے کہ مصنفین کے ذھن میں اتحاد کا مفہوم یہ نہیں تھا جو آج عیسائیت کا عقیدہ ہے بلکہ وہ مسیح علیہ السلام کو انسان یقین کرتے تھے۔

اعتراض

مسیح علیہ السلام نے کئی مقامات پر اپنی الوھیت کو صراحت کے

ساتھ بیان کیا ہے مثلاً وہ کہتا ہے "تم نیچے کے ہو میں اوپر کا ہوں تم دنیا کے ہو میں دنیا کا نہیں ہوں"۔

(یوحنا ۸ : ۲۳)

اسی طرح یسوع نے اپنی ازلیت کو بیان کیا اور فرمایا "اور اب اے باپ! تو مجھے اپنے پاس اس جلال سے جلالی بنا دے جو میں دنیا کی تکوین سے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا"

(یوحنا ۱۷:۵)

ان تمام تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ مسیح ایک ازلی ابدی خدا ہے۔

جواب:

پہلی آیت میں مسیح علیہ السلام نے اپنے کو اوپر کا فرمایا ہے اور شاگردوں کو نیچے دنیا کا فرمایا ہے۔ میرے خیال میں اس کا اصل مفہوم یہ ہوگا کہ میں اس حکم کی پابندی کرتا ہوں جو خداوند کریم سے مجھے ملتا ہے جب کہ تم زمین کی دولت اور دنیاوی سامان اور عزت اور شہرت کا زیادہ خیال رکھتے ہو۔ میں دنیا کا نہیں یعنی دنیاوی جاہ و حشمت اور دنیاوی علائق سے میں نے انحراف کر رکھا ہے جب کہ تم ابھی دنیا کے رزائل سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکے۔ اگر آپ ان الفاظ کے استعمال سے الوہیت مسیح ثابت کرنے پر مصر ہیں تو پھر مسیح علیہ السلام کے حواریوں کو بھی الہ مان لیجئے کیونکہ مسیح نے یہی الفاظ ان کے لئے بھی کہے ہیں۔ دیکھئے۔

"میں نے تیرا کلام انہیں دیا ہے اور دنیا نے ان سے کینہ رکھا

ہے اس لئے کہ جیسے میں دنیا کا نہیں ہوں وہ بھی دنیا کے نہیں"

(یوحنا ب ۱۷: ۱۴)

دنیا کے نہ ہونے کا مفہوم یہاں کس خوبصورتی سے واضح ہو رہا ہے۔ مسیحیوں سے دنیا والے کینہ صرف اس لئے تو رکھتے تھے کہ وہ اس کلام کا اتباع کرتے تھے جو مسیح علیہ السلام کی وساطت سے انہیں آسمان سے ملا تھا۔ اور اسی کلام کی اتباع کی وجہ سے وہ آسمانی ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ دنیاوی اصولوں اور قوانین اور دنیاوی عز و شرف کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انجیل کی آیات کو بیچنے سے انکار کرتے تھے جیسا کہ علماء شرع کا طریقہ تھا۔ ان آسمانی لوگوں سے دنیا کے لوگوں نے کینہ رکھا اور ان پر زندگی اجیرن کر دی۔ مسیح علیہ السلام اس دعا میں ان کی ثابت قدمی کی دعا فرما رہے ہیں۔ آپ دعا کرتے ہیں۔

"میں یہ عرض نہیں کرتا کہ تو انہیں دنیا میں اٹھا لے مگر یہ کہ تو انہیں بدی سے بچا۔ جیسے کہ میں دنیا کا نہیں ہوں وہ بھی دنیا کے نہیں۔"

(یوحنا ب ۱۷: ۱۵، ۱۶)

آپ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کے لئے الوہیت کی دعا تو یقیناً نہیں کی۔ آپ صرف ایک نیکی کی راہ پر گامزن ہونے کی "دنیا کے نہ ہونے" کے الفاظ سے بیان کر رہے ہیں۔

- رہا جلال کا مسئلہ تو اس سے الوہیت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ الوہیت ایسی چیز ہرگز نہیں جو ایک شخصیت کسی شخصیت کو عطا کرے۔ لہٰذا جلال سے مراد نبوت ہو گی۔ اور دنیا سے پیشتر کے الفاظ سے یہی معنی لیا جائے گا۔ مسیح علیہ السلام کا جلال یا نبوت قدیم سے علم باری تعالیٰ میں تھی۔ اگر آپ ایسے الفاظ سے الوہیت اور ازلیت ثابت کریں تو

لازم آئے گا۔ کہ وہ الوہیت مسیح علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کے لئے بھی طلب کی۔ "اور وہ جلال جو تو نے مجھے دیا میں نے انہیں دیا ہے تاکہ وہ ایک ہوں جیسے ہم ایک ہیں"

(یوحنا ۱۷: ۲۲)

جلال سے مراد کلام الٰہی ہے جو نبوت کی وساطت سے حواریوں تک پہنچا ہے اور اس کلام پر عمل پیرا ہو کر حواریوں نے اللہ اور اس کے رسول علیہ السلام کی مکمل تابعداری کی۔ اسی تابعداری کو اتحاد کہا جا رہا ہے۔ "تاکہ وہ ایک ہوں جیسے ہم ایک ہیں" اگر "ہم ایک ہیں" سے مراد اتحاد "اقنوم اب" اور "اقنوم ابن" لیا جائے تو پھر ایسا اتحاد اللہ تعالیٰ اور حواریوں میں ثابت کرنا پڑے گا۔ اور اس اتحاد کی وجہ سے صرف مسیح علیہ السلام ہی الہ نہیں ہوں گے بلکہ حواری بلکہ تمام مومنین بھی الہ قرار پائیں گے۔ اور ایسا عقیدہ تو مسیحی بھی اپنانے کو تیار نہیں ہوں گے۔

الوہیت مسیح کو ثابت کرنے کے لئے حضرت مسیح کا ایک اور ارشاد بڑے زور شور سے پیش کیا جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ عرض کر دوں۔

ابتداء میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ اسی سے سب کچھ پیدا ہوا ایک بھی چیز جو پیدا ہوئی اس کے بغیر پیدا نہ ہوئی۔ اسی میں زندگی تھی اور زندگی انسانوں کا نور تھی اور نور تاریکی میں چمکتا ہے۔ اور تاریکی نے اسے قبول نہ کیا ایک آدمی آموجود ہوا خدا کی طرف سے مرسل جس کا نام یوحنا تھا یہ شہادت کے لئے آیا کہ نور کی شہادت دے تاکہ سب اس کے وسیلہ سے ایمان لائیں۔

وہ خود تو نور نہ تھا لیکن نور کی گواہی دینے کے لئے آیا تھا حقیقی نور وہ تھا۔ جو ہر انسان کو منور کرتا ہے جو دنیا میں آتا ہے وہ دنیا میں تھا اور دنیا اسی سے پیدا ہوئی اور دنیا نے اسے نہ پہچانا وہ اپنے ملک میں آیا اور اس کے اپنوں نے اسے قبول نہ کیا لیکن جتنوں نے اسے قبول کیا اس نے انہیں اقتدار بخشا کہ خداوند کے فرزند بنیں یعنی انہیں جو اس کے نام پر ایمان لاتے ہیں وہ خون سے نہیں نہ جسم کی خواہش سے نہ آدمی کے ارادے سے بلکہ خدا سے پیدا ہوئے۔ اور کلمہ متجسد ہوا اور ہم میں سکونت پذیر رہا.......

(یوحنا ۱: ۱۴)

ان آیات سے مسیحی علماء یہ نظریہ اخذ کرتے ہیں کہ کلمہ (مسیح کا اقنوم) ازلی ہے وہ اقنوم "اب" کی طرح قدیم اور باپ کے ہر لحاظ سے برابر ہے۔ اس اقنوم نے مریم مقدسہ کی وساطت سے جسم اختیار کیا اور ایک انسان کی حیثیت سے ہمارے ساتھ رہا اور اپنی ہدایت سے ہماری راہنمائی کی لیکن بہت سے لوگ نہ سمجھ سکے کہ یہ محض انسان نہیں بلکہ ایک ایسی شخصیت ہے جس میں خدائی کی بھی تمام صفات موجود ہیں۔ اور انسان کی بھی تمام صفات موجود ہیں گویا یہ شخصیت ازلی بھی ہے اور فانی بھی۔ یعنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ازلی ہے لیکن جسم کے اعتبار سے فانی ہے۔ اسی ہستی نے پوری کائنات پیدا کی اور خدا نے اسے پیدا بھی کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسیحی عالم کی تفسیر پیش کر دی جائے تاکہ بات پوری طرح واضح ہو جائے ولیم میکڈونلڈ اپنی کتاب تفسیر الکتاب میں اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ "ابتدا میں کلام تھا" اس کا اپنا کوئی آغاز نہیں۔ وہ ازل سے موجود ہے انسانی ذہن جتنا بھی پیچھے کو

ماضی میں جائے خداوند یسوع موجود ہے۔ وہ کبھی خلق نہیں کیا گیا۔ اس کا کوئی شروع نہیں۔ اس کی شخصیت بالکل الگ اور جدا ہے۔ وہ کوئی خیال یا تصور نہیں نہ کوئی مبہم مثال یا نظیر تھا بلکہ حقیقی شخص (اقنوم) تھا۔ جو "خدا کے ساتھ رہتا تھا وہ نہ صرف خدا کے ساتھ رہتا تھا بلکہ خود خدا تھا"

(ص ۲۴۰۔ ج دوم)

عیسائی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کے برابر ایک غیر مخلوق ازلی ابدی شخصیت یقین کرتے ہیں۔ جو مولود ہوئی اور جسم اختیار کر کے کفارہ ادا کیا۔ گویا مسیح علیہ السلام کی شخصیت ایک لیکن حیثیتیں دو ہیں۔ ایک حیثیت خدائی ہے جو خدا ہی ہے۔ اور دوسری حیثیت انسانی ہے جو تمام عوارض انسانی سے متصف ہے۔ آپ علیہ السلام کی خدائی حیثیت ازلی ابدی غیر مخلوق اور خدا کے برابر ہے لیکن آپ کی انسانی حیثیت فانی محدود اور مولود و مجسم ہے۔ آیت میں آپ کی خدائی حیثیت کو بیان کیا جا رہا ہے نہ کہ انسانی حیثیت کو۔

اس نقطے کو کسی صورت میں سمجھنا ممکن نہیں۔ بھلا ایک شخصیت بیک وقت دو قسم کی متضاد اور متباین صفات سے کیسے متصف ہو سکتی ہے۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اس آیت کی تشریح اور توضیح میں سیر حاصل گفتگو کی ہے یہاں اسے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہاں میں اپنے قارئین کی توجہ ایک اور امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بائیبل نے ملکی صادق کاہن کے لئے بھی ازلیت اور ابدیت کے الفاظ بیان کئے ہیں۔ عبرانیوں کے نام خط میں عہد جدید کے اس حصے کا مصنف لکھتا ہے۔

"یہ بے باپ' بے ماں' بے نسب نامہ ہے۔ نہ ایام کی ابتداء رکھتا

ہے اور نہ زندگی کا اختتام بلکہ ابن خدا کی مانند ہے اور ابدا" کاہن رہتا ہے"

(عبرانیوں کے نام ۷: ۳)

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے تو یہی مستفاد ہوتا ہے کہ ملکی صادق کاہن ماں باپ کے بغیر پیدا ہوئے ہیں۔ اور نہ ایام کی ابتدا رکھتا ہے یعنی ازلی ہے۔ اور نہ زندگی کا اختتام رکھتا ہے بلکہ ابدی اور جاوید ہے۔ لیکن مسیحی علماء اس کے ظاہری معنی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور اس کا مجازی معنی مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح مذکورہ آیت میں مسیح علیہ السلام کے متعلق ازلیت اور ابدیت کے الفاظ کا مجازی معنی لینا ہی بہتر ہو گا۔ کیونکہ مسیح علیہ السلام کی ازلیت اور ابدیت خلاف عقل ہے اور توحید باری تعالیٰ کے منافی ہے۔

اگر کلمہ سے مراد مسیح علیہ السلام کی جگہ ذات واجب الوجود اللہ تعالیٰ لی جائے جو عالم ہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "ابتداء میں کلمہ تھا" یعنی اللہ تعالیٰ جو عالم ہے ہمیشہ سے ہے۔ "کلمہ خدا کے ساتھ تھا" اور صفت علم ازل سے اللہ کے لیئے ثابت ہے "کلمہ خدا تھا" اور وہ ذات جسے خدا کہا جا رہا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ خدا ہے اور "کلمہ خدا تھا" کے الفاظ اس لئے ذکر کیئے گئے ہیں۔ تاکہ کلمہ کا مدلول واضح ہو جائے کیونکہ لفظ کلمہ کا مدلول اس کے علاوہ اور بھی ہے۔

یوحنا کی مذکورہ آیات میں "اور کلمہ متجسد ہوا" کے الفاظ آئے ہیں۔ امام غزالی نے نشاندہی کی ہے کہ معنی میں تصرف کیا گیا ہے۔ صحیح معنی اور کلمہ (خدا) نے اس جسم کو پیدا کیا بنتا ہے۔ تفصیل ترجمہ میں دیکھیں۔ بہرحال مسیح علیہ السلام ایک انسان ہیں۔ اور انہوں نے توحید باری تعالیٰ کو

پوری وضاحت سے بیان کیا۔ عہد جدید اور قدیم میں کہیں بھی تثلیث کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ جن الفاظ سے تثلیث ثابت کی جاتی ہے۔ ان کی نسبت بھی براہ راست مسیح علیہ السلام کی طرف نہیں کی گئی۔ جب نہ تو انبیاء سابقین نے اور نہ ہی نبی مرسل حضرت مسیح علیہ السلام نے تثلیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تو پھر کیوں اس پر اصرار کیا جائے۔ اور اسے عقیدے کا محور اور مرکز قرار دیا جائے۔ ایک بنیادی عقیدے کو آخر کس وجہ سے عہد قدیم میں تشنہ بیان رکھا گیا؟ کیا ان انبیاء کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ پھر مسیح علیہ السلام نے واضح طور پر کیوں نہ فرمادیا کہ تثلیث بنیادی عقیدہ ہے۔ میں بیک وقت انسان بھی ہوں اور خدا بھی۔ آپ تو ہمیشہ اپنے آپ کو ابن انسان اور رسول اللہ' اللہ کے اطاعت گزار نبی کہتے رہے ہیں۔ آپ کے حواری بھی آپ علیہ السلام کو معلم (ربی) اور ایک بڑے نبی کی حیثیت سے دیکھتے رہے ہیں۔ اور انہوں نے کہیں بھی ان کی الوھیت کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ بلکہ بات یہاں تک پہنچی کہ مسیحیت کے بانی پولس (پال) نے بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا یہ تمام عقائد آبائی روایات ہیں جنہیں کونسلوں نے وضع کیا اور توحیدی فرقوں کو کافر اور غناسطی قرار دے کر بزور بازو ختم کر دیا گیا۔

پوری وضاحت سے بیان کیا۔ عہد جدید اور قدیم میں کہیں بھی تثلیث کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ جن الفاظ سے تثلیث ثابت کی جاتی ہے۔ ان کی نسبت بھی براہ راست مسیح علیہ السلام کی طرف نہیں کی گئی۔ جب نہ تو انبیاء سابقین نے اور نہ ہی نبی مرسل حضرت مسیح علیہ السلام نے تثلیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تو پھر کیوں اس پر اصرار کیا جائے۔ اور اسے عقیدے کا محور اور مرکز قرار دیا جائے۔ ایک بنیادی عقیدے کو آخر کس وجہ سے عہد قدیم میں تشنہ بیان رکھا گیا؟ کیا ان انبیاء کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ پھر مسیح علیہ السلام نے واضح طور پر کیوں نہ فرمادیا کہ تثلیث بنیادی عقیدہ ہے۔ میں بیک وقت انسان بھی ہوں اور خدا بھی۔ آپ تو ہمیشہ اپنے آپ کو ابن انسان اور رسول اللہ' اللہ کے اطاعت گزار نبی کہتے رہے ہیں۔ آپ کے حواری بھی آپ علیہ السلام کو معلم (ربی) اور ایک بڑے نبی کی حیثیت سے دیکھتے رہے ہیں۔ اور انہوں نے کہیں بھی ان کی الوہیت کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ بلکہ بات یہاں تک پہنچی کہ مسیحیت کے بانی پولس (پال) نے بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا یہ تمام عقائد آبائی روایات ہیں جنہیں کونسلوں نے وضع کیا اور توحیدی فرقوں کو کافر اور غناسطی قرار دے کر بزور بازو ختم کردیا گیا۔

عقیدہ تثلیث کا تاریخی ارتقاء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تثلیث کا تاریخی ارتقاء بیان کر دیا جائے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ مسیح علیہ السلام اور حواریوں کی طرف منسوب تعلیمات میں تثلیث کا کوئی نشان نہیں ملتا اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ تثلیث ایک من گھڑت عقدہ سے بڑھ کر اور کچھ نہیں اور اس کی دلیل بائیبل مقدس کا عہد قدیم ہے اور عہد جدید کی آیات جن سے تثلیث کے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ کسی بھی صورت تثلیث کے

عقیدہ کو ثابت نہیں کرتیں۔ بلکہ اس کے برعکس وہ توحید خالص کی ترجمانی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ عقلاً" اور نقلاً" تثلیث کا کوئی وجود نہیں یہ محض ہٹ دھری ہے۔ اور تثلیثی بت پرستی مذہب کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے کی بھونڈی کوشش ہے جو اول مسیحیوں نے کی ہے اور آبائی روایت کی لکیر کو آج تک مسیحیت پیٹتی آ رہی ہے۔

پولس کی کوشش یہ رہی ہے کہ غیر اقوام کو کسی نہ کسی صورت مسیحیت میں شامل کیا جائے خواہ اس کے لئے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بے شرعوں کے لئے بے شرع بن جاتا ہے۔ اور شریعت کے پیروکاروں کے لئے شریعت کا پیروکار نظر آتا ہے۔ وہ گناہ گاروں کو گناہ گار بن کر مسیحیت کی طرف لاتا ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ہم عصر شاگرد اس سے خفا ہیں۔ رومی باشندے تثلیث کے قائل ہیں۔ اور یونانی فلسفہ کی پیروی کا رجحان عام ہے اس لئے وہ ان لوگوں کے لئے تثلیث پر اعتراض نہیں کرتا اور انہیں دعوت دیتا ہے اس کے بعد پولس کے متبعین اسی کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اس نئے عقیدہ کی وجہ سے مسیحی دنیا میں اختلاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے تصفیہ کے لئے وقتاً فوقتاً کونسلیں منعقد ہوتی ہیں۔

نیقیہ کی کونسل

مسیح علیہ السلام کی شخصیت کے بارے اختلافات کو دور کرنے کے لئے جو کونسلیں ہوئیں۔ ان میں سب سے پہلی کونسل نیقیہ کے مقام پر منعقد ہوئی۔ نیقیہ موجودہ ترکی کا قدیم کا نام ہے۔ یہ کونسل ۳۲۵ء میں منعقد ہوئی۔ ابن البطریق اس کے انعقاد کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے

ہیں۔ "اس کا (آریوس) کہنا تھا کہ باپ ہی صرف خدا ہے اور بیٹا اس کی مخلوق اور باپ اس وقت بھی موجود تھا جب کہ بیٹا موجود نہیں تھا" آریوس ہی اس عقیدے کا حامی نہیں تھا بلکہ شروع دن سے کئی مسیحی عیسیٰ علیہ السلام کو صرف ایک انسان اور ایک نبی یقین کرتے تھے۔ تاریخ امت قبطیہ کی مصنف رقمطراز ہیں۔ "یہ صرف آریوس کا گناہ نہیں بلکہ اس میں اس سے پہلے دوسرے فرقے بھی شریک رہ چکے ہیں۔ جن سے اس نے یہ عقیدہ لیا تھا لیکن ان فرقوں کا اثر زیادہ نہیں تھا جتنا کہ آریوس کا تھا جس نے لوگوں میں یہ سر خدائی عام کر دیا تھا۔ جس کے ذریعے یہ تعلیم پھیل گئی۔"

اس کونسل کے انعقاد اور مذہبی تنازعات کو ختم کرنے کا اصل سبب سیاسی تھا۔ ڈیوڈ براؤن لکھتا ہے "اس کونسل کا مقصد اس تنازع کو رفع کرنا تھا جس سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ملک کے مشرقی حصہ کی کلیسا تقسیم ہو جائے گی۔

(خدائے ثالوث ص ۱۱۴)

اس کونسل میں شرکت کے دعوت نامے شاہ قسطنطین نے خود ارسال کئے اور مشرق اور مغرب کے مختلف جید علماء کو مدعو کیا گیا تھا۔ ابن البطریق لکھتا ہے "قسطنطین نے تمام شہروں میں منادی کرا دی اور تمام پوپ پادریوں کو بلوا لیا۔ اس طرح نیقیہ میں ۲۰۴۴ پادری جمع ہو گئے۔

ان ۲۰۴۴ پادریوں میں ۳۱۸ پولسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں تثلیثی خیالات کی وجہ سے بادشاہ کے ہاں خصوصی قرب حاصل تھا۔ بادشاہ نے ان ۳۱۸ پادریوں کو الگ بلوا کر انہیں اپنی انگوٹھی، تلوار اور چھڑی دی اور ان کو مذہبی فیصلہ کرنے کا پورا اختیار دے دیا۔ اس فرقہ نے

جو فیصلہ دیا اس کے چیدہ چیدہ نقاط یہ ہیں۔

نیقیا کا اقرار الایمان

ا۔ ہم ایمان رکھتے ہیں ایک خدا، قادر مطلق باپ پر جو آسمان و زمین اور سب دیکھی اور ان دیکھی چیزوں کا خالق ہے۔

۲۔ اور ایک خداوند یسوع مسیح پر جو خدا کا اکلوتا بیٹا ہے کل عالموں سے بیشتر اپنے باپ سے مولود۔

۳۔ خدا سے خدا، نور سے نور، حقیقی خدا سے حقیقی خدا۔

۴۔ مصنوع نہیں بلکہ مولود۔ اس کا باپ اور باپ کا ایک ہی جوہر ہے۔

۵۔ اس کے وسیلہ سے کل چیزیں بنیں۔ خواہ آسمان کی ہوں خواہ زمین کی۔

۶۔ وہ ہم آدمیوں کے لئے اور ہماری نجات کے واسطے آسمان پر سے اتر آیا۔ اور مجسم ہوا اور انسان بنا۔ اس نے دکھ اٹھایا اور دفن ہوا۔ اور تیسرے دن جی اٹھا۔ اور آسمان پر چڑھ گیا اور زندوں اور مردوں کی عدالت کے لئے پھر آئے گا۔

۷۔ اور روح القدس پر

(خدائے ثالوث۔ ڈیوڈ براون ص ۱۱۵، ۱۱۶)

اس فیصلہ کے بعد آریوس اور دوسرے توحیدی فرقوں پر لعنت کی گئی اور انہیں مسیحت سے خارج اور کافر قرار دے دیا گیا۔

۱۷۴۸ علماء مسیحت جن کے متبعین کی تعداد پولوسی فرقہ کے ماننے والوں سے کہیں زیادہ تھی ان کے نظریات کو ایک ہی فرقہ کے ۳۱۸ پادریوں

کی سوچ کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اس پر ستم یہ کہ اسی عقیدے کو مسیحی عقیدہ مقدر کیا گیا اور اس کی پابندی لازمی قرار دی گئی۔ اور یہ اعلان کیا گیا۔ کہ جو شخص اس عقیدہ کی خلاف ورزی کرے گا گردن زدنی ہو گا۔

بادشاہ کے سامنے سیاسی مصلحت تھی۔ مشرقی کلیسا میں زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی تھی۔ جو مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا انکار کرتے تھے۔ یاد رہے کہ مشرق میں ہی حضرت مسیح کے اصل مطیع آباد تھے اور مغربی کلیسا رومی عقائد اور مسیحی عقائد کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ کی اتباع کو لازم سمجھتی تھی۔ اس لئے اس سے تعرض نہ کیا گیا۔

امام ابو زھرہ نے ابو سیبوس (جو ایک مشہور مسیحی مورخ ہے) کے حوالے سے لکھا ہے کہ بادشاہ نے اس وقت تک مسیحیت کو قبول نہیں کیا تھا۔

(المحاضرات فی النصرانیہ ۱۴۶)

بادشاہ نے مسیحی علماء سے ایسے فرقے کا انتخاب کیا جن کے خیالات شرک کے زیادہ قریب تھے اور رومی تثلیثی عقیدہ کو پھیلانے میں معاون ہو سکتے تھے۔ صرف پولوسی فرقہ ہی اس مقصد پر پورا اتر سکتا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے یہ اعلان کیا کہ خواہ اناجیل کچھ کہیں اس فیصلے کی اتباع فرض ہے۔ اگر کسی کتاب میں الوہیت مسیح کے خلاف کوئی تعلیم ہے تو اس کتاب کی قرأت ممنوع ہے۔ صرف ان کتب کو رکھنا اور پڑھنا صحیح ہے جو اس عقیدہ کی ترجمان ہو۔ جس کا اعلان کونسل نے کیا ہے۔ بہت ساری کتابوں کو جلا دیا گیا۔

مگر توحیدی فرقوں کا اتنا زور تھا۔ اور وہ تعداد میں اس قدر زیادہ تھے کہ انہیں آسانی سے ختم کرنا آسان نہیں نہ تھا۔ اس لئے بہت سی

تحریکیں اٹھتی رہیں اور الوہیت مسیح کا عقیدہ غالب نظریہ نہ بن سکا۔ اس لئے جنگ و جدل کا سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔

۲۔ قسطنطنیہ کی پہلی کونسل

یہ کونسل ۳۸۱ء میں منعقد ہوئی۔ اس کونسل کے انعقاد کا مقصد روح القدس کے متعلق اختلاف کو ختم کرنا تھا۔ پولوسی فرقہ نے بادشاہوں کے زیر اثر تثلیث کے کونے کو پورا کرنے کے لئے روح القدس کی الوہیت کا اعلان کر دیا۔ توحیدی فرقے بھلا اس نظریے کو کیسے قبول کرتے۔ ایک نزاع اٹھ کھڑا ہوا۔ پولوسی فرقہ الوہیت کا نظریہ رکھتا تھا۔ جبکہ باقی مسیحی اس کے برعکس روح القدس کے مخلوق ہونے کا نظریہ رکھتے تھے ان فرقوں میں مکدونی فرقے نے الوہیت روح القدس کے خلاف آواز اٹھائی۔ آریوسی فرقہ جو مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا منکر تھا۔ اور جسے نیقا کی کونسل نے غلط قرار دے دیا۔ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مکدونی فرقے کی تائید کی۔ اور ساپوس کے ماننے والے بھی مکدونیوں کی ہمنوائی کرنے لگے۔ اور ملک کے طول و عرض سے ایک دفعہ پھر علی الاعلان توحید کی آوازیں آنے لگیں۔

اسکندریہ کا بطریق جو بادشاہ کا منظور نظر اور روح القدس کی خدائی کا عقیدہ رکھتا تھا۔ بادشاہ کو ایک کونسل کے منعقد کرنے پر تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ ملک کے اطراف و اکناف سے ۱۵۰ اسقف اکٹھے ہوئے۔ اس میں زیادہ علماء شریک نہیں ہوئے۔ کیونکہ وہ نیقیہ کی کونسل سے بددل ہو چکے تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ حقیقت کی توضیح مطلوب نہیں۔ بلکہ حکماً بت پرستی کو رواج دینا مقصود ہے۔ اس لئے وہ الگ

رہے۔ اور پولوسی فرقہ کو عقائد وضع کرنے میں کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس لئے انہوں نے روح القدس کی الوہیت کو بھی مسیحی عقائد میں شامل کر لیا۔

ابن البطریق لکھتا ہے۔ "تیموتاؤس اسکندریہ کے بطریق نے کہا روح القدس ہمارے نزدیک غیر اللہ نہیں ہے۔ اور روح اللہ ایسی چیز نہیں جس میں اللہ کی حیات نہ ہو۔ جب ہم کہیں گے کہ روح القدس مخلوق ہے۔ تو گویا ہم اللہ کی حیات کو مخلوق کہہ رہے ہیں۔ کہ وہ زندہ نہیں ہے اور جب ہم یہ کہیں گے تو اس سے کفر لازم آئے گا۔ اور جو کفر کرے گا اس پر لعنت واجب ہو گی۔"

۳۔ افیسس (Epesus) کی پہلی کونسل

اس کونسل کا انعقاد ۴۳۱ء میں ہوا۔ ایشائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر از مشہور بندرگاہ کے نزدیک افس شہر کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ موجودہ ترکی کے شہر ازمیر (سمونا) سے ۲۰، ۲۵ میل جنوب میں یہ شہر واقع ہوا ہے۔

جیسا کہ نیقیا اور قسطنطنیہ کے کونسلوں کے فیصلوں سے ظاہر ہے کہ مسیح علیہ السلام اور روح القدس علیہ السلام کی الوہیت کو عقیدہ میں شامل کر لیا گیا۔ لیکن بہت سارے لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے تھے۔ حکومت نے سختی کی اور اس وجہ سے ظاہراً یہ نزاع ختم ہو گیا۔ لیکن ۴۳۱ء میں ایک دفعہ پھر مسیح علیہ السلام کی شخصیت زیر بحث آ گئی۔ اور ان کی الوہیت کا انکار ہونے لگا۔ لیکن حکومت کے وجہ سے یہ آواز بہت دھیمی رہی۔ قسطنطنیہ کے بطریق نسطور نے اعلان کیا کہ

"میرا عقیدہ ہے کہ یہاں ایک اقنوم اور ایک فطرت ہے۔ الوھیت کا اقنوم باپ سے نکلا ہے اور الوھیت کی نسبت باپ کی طرف ہے۔ اور انسان کی طبیعت مریم سے پیدا ہوئی۔ اس طرح مریم انسان کی ماں ہے خدا کی ماں نہیں۔ اور وہ مسیح جو لوگوں کے درمیان ظاہر ہوا۔ محبت کے ذریعے بیٹے سے متعلق ہے۔ اور خدا اور اس کے بیٹے کے درمیان رشتہ محبت ہے۔ اور ظاہری مسیح خدا نہیں ہے لیکن وہ خدا کی دی ہوئی نشانیوں اور بزرگی کے سبب مبارک ہے۔"

نسطور نے الوھیت مسیح کا انکار دبے لفظوں میں کیا تو پولوسی فرقہ پھر حرکت میں آگیا۔ اور اپنا روایتی حربہ استعمال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ اور حکومت کے حکم پر انطاکیہ' بیت المقدس اور روم کے اسقف جمع ہوئے۔ اسکندریہ کا بطریق نسطور اس کا ہمنوا تھا۔ اس میں کل ۲۰۰ عالم شریک ہوئے نسطور اور ہمنوا شریک نہ ہوئے۔ کیونکہ ان کونسلوں کی کارکردگی واضح ہو چکی تھی۔ کونسل نے اپنے فیصلے میں ان الفاظ کا اضافہ کیا۔ "کنواری مریم خداوند کی ماں ہیں مسیح حقیقی خدا ہے۔ اور انسان بھی ہے اس میں دو طبیعتیں ہیں لیکن یہ اقنوم میں باپ کے ساتھ ایک ہے۔ اور نسطور پر لعنت ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ انطاکیہ کے بطریک نے رجوع کر لیا (واللہ اعلم) لیکن نسطور اپنے عقیدے پر ڈٹا رہا۔ اور رجوع نہ کیا جب اس پر حکومت نے سختی کی تو وہ مصر کو بھاگ گیا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ نسطوری فرقہ مشرق میں خوب پھیلا اور عراق' موصل' فرات اور جزیرہ میں اس کی خوب تشہیر ہوئی۔

۴۔ خلقیدونیہ کی کونسل

یہ کونسل اکتوبر ۴۵۱ء میں منعقد ہوئی اس کونسل کے انعقاد کی غرض و غایت مسیح علیہ السلام کی طبیعت کے متعلق نزاع کو ختم کرنا تھا۔ اسکندریہ کے کیسہ کی رائے تھی کہ مسیح علیہ السلام کی ایک ہی طبیعت ہے اور اس ایک ہی طبیعت میں لاہوتی اور ناسوتی وصف جمع ہیں۔ اسکندریہ کے اس بطریرک کا نام دسقورس تھا۔ اس نے اپنی رائے کو منوانے کے لئے افسس میں ایک کونسل قائم کی۔

قسطنطنیہ کے بطریرک نے اسے چوروں کی کونسل قرار دیا اور دوسری بہت ساری کلیساؤں نے بھی اس کی تائید کی۔ افسس کی کونسل کے فیصلے کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔

افسس کے اس فیصلے کو رد کرنے پر ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ قسطنطنیہ کے بطریرک کو قتل کر دیا جائے گا۔ مسیحیت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ بعض اس مجلس کے فیصلے کو واجب التسلیم خیال کرتے اور بعض لوگ اسے ناقابل تسلیم گردانتے۔ ظاہر ہے حکومت اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتی بادشاہ اور اس کی ملکہ نے خلقیدونیہ کے مقام پر ایک مجلس منعقد کی جس میں ۵۲۰ علماء نے شرکت کی۔ اس کونسل کی صدارت ملکہ نے کی۔

روم کے مندوبین نے مطالبہ کیا کہ اسکندریہ کے بطریرک دسقورس کو کونسل سے نکال دیا جائے کیونکہ اس نے افسس میں رسولوں کے نائب قسطنطنیہ کے پوپ کی اجازت کے بغیر کونسل منعقد کی ہے۔ ملکہ نے اسے تعصب اور ہٹ دھرمی سمجھا اور کوئی توجہ نہ دی۔ مجلس کی

کاروائی شروع ہوتے ہی آوازیں بلند ہوئیں۔ بات ہاتھاپائی اور گالی گلوچ تک جا پہنچی۔ ایک طرف انجیل کی تلاوت ہوتی رہی اور دوسری طرف علماء ایک دوسرے کو گالیاں دیتے رہے۔ بحث و تمحیص تو مقصود نہ تھی۔ حکومت سیاسی مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ آخر میں یہ فیصلہ سنایا گیا۔

مسیح کی ایک طبیعت نہیں بلکہ دو طبیعتیں ہیں۔ لاہوت ایک الگ طبیعت ہے۔ اور ناسوت ایک الگ طبیعت۔ اور یہ دونوں طبیعتیں مسیح میں یکجا ہو گئیں۔

ابن البطریق اس کونسل کے فیصلے کو ان الفاظ میں لکھتا ہے "مریم عزراء نے ہمارے الہ ربنا یسوع المسیح کو جنا جو خدا باپ کے ساتھ الہٰی طبیعت میں ایک ہے۔ اور لوگوں کے ساتھ انسانی طبیعت میں ایک۔ اور انہوں نے گواہی دی کہ بے شک مسیح کی دو طبیعتیں ہیں اور ایک شخصیت اور ایک اصل ہے اور نسطور پہ لعنت بھیجی اور اسی طرح وسقورس پر لعنت بھیجی۔ جو لوگ نسطور یا وسقورس کے ہم خیال ہیں ان پر بھی لعنت بھیجی۔ افسس کی دوسری مجلس کے فیصلے کو ناقابل قبول قرار دیا۔ وسقورس فلسطین کو بھاگ گیا۔"

(المحاضرات ص ۱۵۷ بحوالہ تاریخ ابن البطریق)

مسیح علیہ السلام کی شخصیت کے بارے نئے نئے نظریات سامنے آئے اور آئے دن مسیحیت مختلف فرقوں میں بٹتی چلی گئی۔ اور اختلافات کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

انہی دنوں کچھ راہب تناسخ ارواح کے عقیدے کو رواج دینے لگے تناسخ ارواح سے قیامت کا انکار لازم آتا ہے۔ یہ اناجیل اور عہد قدیم کی آیات سے کھلا انحراف تھا۔ اس لئے ایک کونسل کے ذریعے اس

عقیدے کی تشہیر پر پابندی عائد کر دی گئی۔

قسطنطنیہ کی دوسری کونسل

جو راہب تناسخ ارواح کے قائل تھے انہوں نے ایک اور عقیدے کی تشہیر شروع کر دی یہ عقیدہ مسیح کے خیالی پیکر کا عقیدہ تھا۔ اس غناسطی فرقے کے رد کے لئے قسطنطیہ میں ایک کونسل کا اہتمام ہوا۔ اسے قسطنطیہ کی دوسری کونسل کہتے ہیں۔ اس کونسل میں ۱۴۰ اسقف اکٹھے ہوئے پہلی کونسلوں کے فیصلوں کو من و عن تسلیم کرنے پر زور دیا گیا اور تناسخ ارواح اور خیالی پیکر کے عقیدوں کو کفر کہا گیا اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا۔ کہ ایسے بدعتی لوگوں کو ہر قسم کے مذہبی عہدے سے الگ رکھا جائے۔

قسطنطیہ کی تیسری کونسل

یہ کونسل ۶۸۰ء میں منعقد ہوئی۔ کونسل کے انعقاد کا مقصد مارونیہ فرقے کا رد کرنا تھا۔ اس فرقے کا عقیدہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کی طبیعتیں تو دو ہیں۔ لاہوتی اور ناسوتی لیکن مشیئت ایک ہے۔ کیونکہ دونوں طبیعتیں اقنوم واحد میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس لئے مشیئت ایک ہے۔

اس مجلس میں ۲۸۹ علماء نے شمولیت کی۔ اور مارونیہ فرقے کا رد کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا گیا کہ "مسیح کی دو مشیئتیں ہیں۔ ایک لاہوتی اور دوسری ناسوتی مشیئت۔ وہ شخص لعنت کا مستحق ہے جو مسیح کے لئے ایک طبیعت اور ایک مشیئت کا قائل ہے۔"

(المسیحیت یوسف جلبی)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کونسل کے اقرارالایمان کو تفصیل

سے بیان کر دیا جائے۔ اس اقرار الایمان کو ابن البطریق نے اپنی کتاب "تاریخ ابن البطریق" میں نقل کیا ہے۔

"بے شک ہم ایمان لاتے ہیں کہ ثالوث میں سے ایک اکلوتا بیٹا ہے جو ازلی دائمی کلام ہے جو ایک اقنوم اور ایک اصل میں خدا کے برابر ہے۔ جو اپنے ناسوت کے اعتبار سے مکمل انسان جانا جاتا ہے اور لاہوت کے اعتبار سے مکمل خدا جانا جاتا ہے۔

ہمارا رب یسوع مسیح کی دو طبیعتیں ہیں۔ اور یہ دونوں طبیعتیں مکمل اور تام ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سرگرم عمل ہیں اور ایک ہی اقنوم میں دو مشیئیں ہیں۔

اور ہم گواہی دیتے ہیں جس طرح خلقید وینہ کی کونسل نے گواہی دی ہے کہ خدا بیٹا نے آخری زمان میں سیدنا مریم مقدسہ عزراء کی وساطت سے ایک انسان کا جسد اختیار کیا اور یہ انسان اللہ کی رحمت سے بشر سے محبت رکھتا ہے۔ لیکن تجسم کی وجہ سے فساد اور اختلاط واقع نہیں ہوا اور نہ ہی اس تجسم کی وجہ سے دونوں حیثیتوں میں کوئی فرق اور جدائی ہوئی ہے۔ وہ یکتا ہے انسان جیسے کام کرتا ہے کیونکہ اس کی ایک طبیعت انسانی ہے وہ خدا جیسے کام کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی ایک طبیعت الہی ہے۔ وہ ابن وحید ہے کلمہ ازلی ہے۔ جس نے تجسم اختیار کر کے گوشت پوست کی انسانیت اختیار کر لی ہے۔ جیسا کہ انجیل مقدس کہتی ہے۔ لیکن انسان ہو کر وہ اپنے ازلی جلال سے خالی نہیں ہوا۔ اس طرح اس کی حقیت بدلی نہیں۔ بلکہ وہ اپنے دونوں کاموں دونوں مشیتوں اور دونوں طبیعتوں کی وجہ سے بیک وقت خدا بھی ہے۔ اور انسان بھی۔ انہی دونوں حقیقتوں کے ذریعے حق کا فرمان مکمل ہوتا ہے ہر ایک طبیعت دوسری طبیعت سے مل کر سرگرم

عمل ہے دونوں طبیعتیں دونوں مشیتوں کے تحت عمل کرتی ہیں اور ان دونں میں کوئی تضاد واقع نہیں ہے۔"

(المحاضرات فی النصرانیہ۔ ابو زھرہ ص ۱۶۳)

(بحوالہ ابن البطریق)

نیقیہ کی دوسری کونسل

ایک عام مجلس میں قسطنطین خامس نے ۷۵۴ء کو عبادت خانوں میں عیسیٰ علیہ السلام اور مریم مقدسہ کی تماثیل رکھنے کو ممنوع قرار دے دیا۔ اور مریم مقدسہ سے شفاعت کے عقیدہ کو رد کر دیا۔

تماثیل کو دوبارہ رواج دینے کی غرض سے نیقیہ میں ایک کونسل قائم ہوئی جس کا اہتمام ملکہ ایرینی نے کیا۔ اس کونسل میں مجلس عامہ کے فیصلے کو رد کیا گیا اور عبادت خانوں، گھروں اور راستوں پر تماثیل کو لازمی قرار دیا گیا لیکن ان کی عبادت ممنوع رہی

استاذ امین الغولی کی رائے یہ ہے کہ ممانعت مسلمانوں کی خوشنودی کے لئے تھی جو اس وقت ہر لحاظ سے عروج پر تھے لیکن اس فیصلے کی تنسیخ عوامی رد عمل کی وجہ سے عمل میں آئی۔

(صلۃ الاسلام باصلاح المسیحیہ)

مغربی لاطینی کونسل

یہ کونسل ۸۶۹ء کو قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی۔ نیقیہ کی کونسل میں روح القدس پر ایمان کو شامل عقیدہ کیا گیا لیکن اس کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسیح علیہ السلام کی شخصیت وجہ نزاع تھی۔ اور عام آدمی نہیں بلکہ بڑے بڑے

اسقف ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے تھے۔ حکومت نے اختلافات کو ختم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ بحث و تمحیص کے بغیر فیصلے مسلط کئے گئے۔ اور ان کے خلاف ہر آواز کو .با دیا گیا۔ مسیح علیہ السلام کو ہر لحاظ سے جب مکمل خدا تسلیم کر لیا گیا تو روح القدس کو خدائی میں شریک کرنے کی بات چل نکلی۔ قسطنطنیہ کے بطریرک نے فتویٰ دیا کہ روح القدس صرف باپ سے نکلا ہے۔ روم کے بطریرک کو جب اس فتویٰ کی اطلاع دی گئی تو وہ سیخ پا ہو گیا کہ روح القدس باپ اور بیٹے دونوں سے منبثق ہے۔ قسطنطنیہ کے بطریرک نے اپنے فتوے کو تسلیم کروانے کے لئے ایک کونسل منعقد کی اور اس فتوے کو مسیحی عقائد میں شامل کر دیا۔

روم کے بطریرک نے ایک الگ کونسل کا اہتمام کیا اور اپنے فتوے کو مسیحی عقائد کا جزو لاینفک قرار دے دیا اور اس کی مخالفت کو کفر سے تعبیر کیا۔ حکومت نے فوسیوس کو بطریرک کے عہدے سے معزول کر دیا۔ اور اس کی جگہ اور عالم قسطنیہ کا بطریرک مقرر ہوا۔ اس نے آتے ہی فوسیوس کے عقیدے کے رد کے لئے ایک کونسل منعقد کی اور اسے کافر اور مستحق لعنت ٹھہرایا۔

اس کونسل کے فیصلے کی تین شقیں بہت اہم ہیں۔

۱۔ روح القدس کا انبثاق خدا باپ اور بیٹے دونوں سے ہے۔

۲۔ اہم امور اور عقائد کا فیصلہ روم کے کلیسا کے پوپ کریں گے۔

۳۔ پوری دنیا کے مسیحی تمام رسوم و رواج میں روم کے پوپ کے مقلد ہوں گے۔

اس فیصلے کے آخر میں فوسیوس پر لعنت کی گئی۔

قسطنطنیہ کی پانچویں کونسل

یہ کونسل ۸۷۹ء میں منعقد ہوئی فوسیوس جو روح القدس کے صرف باپ سے منبثق کے عقیدے کا قائل تھا دوبارہ مذہبی عہدہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے روم کے بطریک کے فتوے کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے اس پر لعنت کی۔

اس کونسل کو مشرقی یونانی کونسل کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے فیصلے سے مسیحیت مستقل دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک مغربی لاطینی کلیسا اور دوسری مشرقی یونانی کلیسا۔ ان اختلافات نے جنگوں کی صورت اختیار کر لی۔ چونکہ مغربی کلیسا کو حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی اس لئے مشرقی کلیسا پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے۔

مغربی کلیسا کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کلیسا کی بنیاد پطرس حواری نے رکھی ہے اور روم کا پوپ پطرس کا نائب اور قائم مقام ہے اس لئے اس کی تقلید غیر مشروط طور پر واجب ہے۔

سوسنہ سلیمان کے مصنف اس دعویٰ کو حقیقت پر مبنی قرار دیتے ہیں اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں۔ کہ مغربی لاطینی کلیسا ام الکنائس ہے اور دنیا بھر کے چرچز کی معلم اور رہنما ہے تقلیدی تعالیم میں کونسلوں کے انتظامات اور ان کی ترتیب میں یہی کلیسا حکم دیتی ہے اور ایطالیا، بلجیم، فرانس، اسپانیا، پرتگال اور دنیا کے دوسرے خطوں میں پھیلے ہوئے دوسرے تمام عیسائیوں میں اس کا بہت زیادہ اثر و رسوخ ہے۔

روما کی کونسل

یہ کونسل ۱۱۲۳ء میں منعقد ہوئی۔ حکومت دونوں دھڑوں کو

مطمئن رکھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ مشرقی کلیسا اتنی بھی کمزور نہیں ہوئی تھی کہ حکومت اس سے بے اعتنائی برتتی۔ اس لئے حکومت مشرقی کلیسا میں بدستور عہدے تقسیم کرنے کی پالیسی پر گامزن تھی۔ پوپ اعظم نے روم میں یہ کونسل منعقد کر کے حکومت کی اس پالیسی پر تنقید کی اور تمام حقوق کی اجارہ داری کا دعویٰ کیا۔

اس کے بعد کئی کونسلیں ہوئیں لیکن ان کی حیثیت عام کونسلوں کی تھی۔ اور ان کونسلوں کے انعقاد کا مقصد پوپ اجارہ داری کو رواج دینا تھا۔ بعض کونسلوں میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا۔ کہ نجات کلیسائے روم کے ہاتھ میں ہے اور وہ معصوم عن الخطا ہے۔

مغفرت ناموں کی فروخت اور دوسری بے اعتدالیوں کی وجہ سے کئی لوگ پوپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ کٹھ پتلی حکومتیں پوپ کے ہاتھ میں کھلونا تھیں۔ ایسے لوگوں کو پھانسی دی گئی۔ کتابوں پر تنقید ہونے لگی۔ عقائد زیر بحث آئے رسومات پر بات ہوئی۔ جب سکوت کا بند ایک دفعہ ٹوٹا تو پوپ کے اختیار کو بہا لے گیا۔ پروٹیسٹنٹ فرقے کے بانی کی جرات مندانہ اور مبنی برحقیقت تنقید نے عیسائیوں کی آنکھیں کھول دیں۔

سائنسی ترقی نے بائیبل کے تنقیدی مطالعہ کی راہ کھول دی۔ بائیبل میں تحریف کا اعتراف ہونے لگا۔ مسیح علیہ السلام کی شخصیت پھر زیر بحث آئی۔ اب پوپ کے اختیار کم تھے اس لئے دار و گیر کا سلسلہ نہیں چل سکا۔ اور مسیح علیہ السلام کی انسانیت کا اقرار ہونے لگا۔ قرآن کریم کے تراجم اور فطرت کے مطابق اس کی تعلیمات نے مسیحی دنیا میں تہلکا مچا دیا مغرب میں اسلام کی اشاعت زوروں پر ہے اور پادری ان ممالک کا رخ کر رہے ہیں جن میں شرح خواندگی کم ہے تاکہ عیسائیت کی ڈوبتی کشتی کو بچایا جا سکے۔

لیکن دیکھنے والے کہہ رہے ہیں کہ عقل کے خلاف بائبل کی آیات سے دور کونسلوں کی وضع کردہ یہ تعلیمات زیادہ دیر تک نہیں چل سکیں گی۔ اور نتیجہ۔ لوگ اندھی تقلید کے اس گرداب سے نکل کر قرآن کریم کو اپنا لیں گے۔

توحید باری تعالیٰ ہر نبی کی تعلیمات کا محور و مرکز ہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بھی عمر بھر توحید باری تعالیٰ کی تعلیم دیتے رہے۔ بائبل مقدس میں تحریف کے باوجود آج تک توحید باری تعالیٰ کی تعلیم پوری آب و تاب سے موجود ہے۔ چند آیات جن میں بالواسطہ مسیح علیہ السلام کو خدا کہا گیا ہے۔ لیکن اس سے ان کی الوھیت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ لفظ خدا یا خداوند بائبل میں فرشتوں' عام انسانوں حتیٰ کہ شیطان رجیم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ کوئی شخص ان کی الوہیت کا قائل نہیں ہے۔ بائبل میں مسیح علیہ السلام کی گفتگو جو کچھ موجود ہے اس سے تاثر ابھرتا ہے کہ آپ علیہ السلام ایک نبی کی حیثیت سے اللہ کی وحدانیت' اپنی رسالت' شریعت کاملہ اور اخلاقیات کی تعلیم دیتے رہے آپ نے اصطلاحی معنوں میں نہ تو اپنے آپ کو خدا کہا نہ خدا کا بیٹا اور نہ ہی یہ تعلیم دی ہے کہ وہ صلیب پا کر دنیا کی نجات کا سامان کرنے آئے ہیں۔ یہ تمام تعلیمات مختلف کونسلوں اور انسانوں کی وضع کردہ ہیں۔ پہلے تو ان عقیدوں کو بزور تسلیم کروا لیا گیا۔ بعد میں اس نے اندھی تقلید کی صورت اختیار کر لی۔ فلسفہ یونانی نے اسے تقدس عطا کر دیا۔ بائبل کی آیات کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی اور فلاسفہ کی موشگافیوں کو مان لیا گیا۔

لیکن دیکھنے والے کہہ رہے ہیں کہ عقل کے خلاف بائیبل کی آیات سے دور کونسلوں کی وضع کردہ یہ تعلیمات زیادہ دیر تک نہیں چل سکیں گی۔ اور نتیجہ۔ لوگ اندھی تقلید کے اس گرداب سے نکل کر قرآن کریم کو اپنا لیں گے۔

توحید باری تعالیٰ ہر نبی کی تعلیمات کا محور و مرکز ہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام بھی عمر بھر توحید باری تعالیٰ کی تعلیم دیتے رہے۔ بائیبل مقدس میں تحریف کے باوجود آج تک توحید باری تعالیٰ کی تعلیم پوری آب و تاب سے موجود ہے۔ چند آیات جن میں بالواسطہ مسیح علیہ السلام کو خدا کہا گیا ہے۔ لیکن اس سے ان کی الوہیت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ لفظ خدا یا خداوند بائیبل میں فرشتوں' عام انسانوں حتیٰ کہ شیطان رجیم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ کوئی شخص ان کی الوہیت کا قائل نہیں ہے۔ بائیبل میں مسیح علیہ السلام کی گفتگو جو کچھ موجود ہے اس سے تاثر ابھرتا ہے کہ آپ علیہ السلام ایک نبی کی حیثیت سے اللہ کی وحدانیت' اپنی رسالت' شریعت کاملہ اور اخلاقیات کی تعلیم دیتے رہے آپ نے اصطلاحی معنوں میں نہ تو اپنے آپ کو خدا کہا نہ خدا کا بیٹا اور نہ ہی یہ تعلیم دی ہے کہ وہ صلیب پا کر دنیا کی نجات کا سامان کرنے آئے ہیں۔ یہ تمام تعلیمات مختلف کونسلوں اور انسانوں کی وضع کردہ ہیں۔ پہلے تو ان عقیدوں کو بزور تسلیم کروا لیا گیا۔ بعد میں اس نے اندھی تقلید کی صورت اختیار کر لی۔ فلسفہ یونانی نے اسے تقدس عطا کر دیا۔ بائیبل کی آیات کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی اور فلاسفہ کی موشگافیوں کو مان لیا گیا۔

معجزات برھان رسالت ہیں

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی الوھیت کے عقیدہ کی ایک اہم وجہ آپ علیہ السلام کے معجزات ہیں۔ آپ علیہ السلام کے معجزات اس سے قبل تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں ان آیات کی طرف توجہ مبذول کرنا مقصود ہے جن میں ان معجزات کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔

مسیحی علماء خصوصاً قدیم دور سے تعلق رکھنے والے حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کو ان کی الوھیت کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔ اور یہ محض مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ اولین مسیحی ان معجزات سے ہی الوہیت مسیح کے ثبوت کے لئے استدلال کرتے تھے۔

مقدس اثنا سیس (المتوفی ۳۷۳ء) مسیحی بزرگوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے نیقیا کی کونسل میں بھی شرکت کی تھی۔ انہوں نے اپنی کتاب "کلمہ اللہ کا تجسم" میں الوھیت مسیح کو زوردار انداز میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختلف دلائل میں وہ مسیح علیہ السلام کے معجزات کو بھی دلائل الوھیت میں لاتا ہے "مسیح کی الوھیت اس کے عظیم کاموں سے ظاہر ہوتی ہے" کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں۔

"کون ایسا انسان یا جادوگر یا جبار یا شہنشاہ ہوا ہے جس میں اتنی طاقت ہوئی ہو کہ وہ اکیلا اتنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکے...... اگر کوئی کہے کہ ایسے کام انسان کے بس کے ہیں تو ہم اس سے درخواست کرتے ہیں کہ کوئی ایسا آدمی پیش کرے جس نے کسی زمانے میں ایسے کام کیے ہوں تو ہم قائل ہو جائیں گے۔"

(ص ۸۸، ۸۹)

مسیحی علماء کے نزدیک تو معجزات یسوع علیہ السلام کی الوھیت کو ثابت کرتے ہیں لیکن حضرت مسیح علیہ السلام نے خود انہیں اپنی رسالت کی دلیل قرار دیا ہے۔ ہم تو عیسیٰ علیہ السلام کی بات مانیں گے۔ کیونکہ آپ ہر گناہ سے پاک اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

۱۔ جو کام میرے باپ نے مجھے پورے کرنے کو دیے...... وہ میری گواہی دیتے ہیں کہ باپ نے مجھے بھیجا ہے (یوحنا ۵:۳۶)

یعنی یہ کام (معجزات) الوھیت کی دلیل نہیں بلکہ مری رسالت کا ثبوت ہیں۔

۲۔ یہودیوں کو عیسیٰ علیہ السلام کے مسیح موعود ہونے میں شک تھا، عید تجدید کے موقع پر انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہا "اگر تو مسیح

ہے تو ہم سے صاف کہہ دے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ میں نے تو تم سے کہہ دیا ہے۔ مگر تم یقین نہیں کرتے۔ جو کام میں اپنے باپ کے نام سے کرتا ہوں وہی میرے گواہ ہیں۔"

(یوحنا ۱۰: ۲۴، ۲۵)

مسیح علیہ السلام ان معجزات کو قدرت خداوندی کا نتیجہ اور اپنے نبی ہونے کا ثبوت قرار دیتے تھے۔

۳۔ مسیح علیہ السلام اپنے انوکھے اور بے مثال معجزات کو دلیل نبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور منکرین کو گناہ گار ٹھہراتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ "اگر میں ان کے درمیان وہ کام نہ کرتا جو کسی اور نے کبھی نہیں کئے تو وہ گناہ گار نہ ٹھہرتے مگر اب تو انہوں نے دیکھا ہے اور پھر بھی مجھ سے اور میرے باپ دونوں سے کینہ رکھا ہے۔"

(یوحنا ۱۵: ۲۴)

انجیل متی میں ہے۔ کہ حضرت یحیٰ علیہ السلام نے قید خانے سے چند آدمی بھیجے تاکہ وہ دریافت کریں کہ یسوع علیہ السلام واقعی المسیح ہیں تو جواباً مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ یحیٰ علیہ السلام کو بتاتا کہ

"اندھے دیکھتے ہیں اور لنگڑے چلتے ہیں کوڑھی پاک صاف کئے جاتے ہیں اور بہرے سنتے ہیں مردہ زندہ کئے جاتے ہیں اور مسکینوں کو خوشخبری دی جاتی ہے"

(متی ۱۱: ۱تا۶)

اس ضمن میں اور بھی بہت سی آیات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ان آیات میں جس قدر صراحت ہے شاید دوسری آیات میں نہ ہو۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ معجزات نبوت کی دلیل ہوتے ہیں الوہیت کی

نہیں ورنہ تمام انبیاء کو خدا ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ہر ایک نبی کو معجزات عطا کیے گئے ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ مسیح علیہ السلام بعض معجزات میں منفرد ہیں تو انفرادیت بھی الوہیت کو ثابت نہیں کرتی کیونکہ معجزات میں کئی دوسرے انبیاء بھی منفرد ہیں۔

دعائے مسیح

دعا احتیاج کی علامت ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اس لئے وہ دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ غنی اور بے پرواہ ہے۔ اس لئے وہ دعا مانگنے سے پاک ہے۔ مسیح علیہ السلام محض انسان تھے اور ایک انسان ہونے کے ناطے سے ہمیشہ اپنے رب سے دست بہ دعا رہے۔

۱۔ مرقس لکھتا ہے "اور علی الصباح پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کر نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا کی"

(مرقس ۱:۳۵)

مرقس لکھتا ہے کہ مسیح علیہ السلام آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دعا کرتے تھے جیسا کہ ایک عاجز بندہ اپنے کریم خدا سے دامن پھیلا کر مانگتا ہے "اور آسمان کی طرف دیکھ کر حرکت چاہی"

(مرقس ۶:۴۱)

۳۔ حضرت مسیح اپنے شاگردوں سے الگ ہو جاتے ہیں اور خلوت میں اپنے خدا سے دعا مانگتے ہیں مرقس لکھتا ہے "اور ان کو رخصت کر کے پہاڑ پر دعا کرنے گیا"

(۶ : ۶۴)

۴۔ لوقا بھی آپ کی دعا کا تذکرہ کرتا ہے "اور وہ ایک جگہ دعا

کر رہا تھا"

(۱:۱۱)

۵۔ اور یوں ہوا کہ جب وہ تنہائی میں دعا کر رہا تھا

(لوقا۹:۱۸)

۶۔ "وہ پطرس' یوحنا اور یعقوب کو ساتھ لے کر ایک پہاڑ پر دعا کرنے گیا۔

(لوقا۹:۲۸)

۷۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پوری پوری رات دعا میں گزار دیتے تھے اور اپنے خاص ہونے پر تشکر اور امتنان بجالاتے تھے لوقا بیان کرتا ہے "اور ان دنوں وہ پہاڑ پر دعا کرنے کو گیا اور خدا سے دعا کرتے ہوئے تمام رات گزاری"

(لوقا۶:۱۲)

مشکل وقت میں مسیح علیہ السلام نے نہ صرف خود دعا کی بلکہ اپنے شاگردوں کو بھی دعا کرنے کی تلقین کی لوقا بیان کرتا ہے "وہ زیتون کے پہاڑ کو گیا......ان سے کہا دعا کرو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو اور وہ ان سے جدا ہو کر تخمیناً پتھر کا ٹپا آگے بڑھا اور گھٹنے ٹیک کر دعا کرتے ہوئے کہنے لگا اے باپ! اگر تو چاہے تو یہ پیالہ مجھ سے ہٹا لے لیکن میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو۔ اور آسمان سے ایک فرشتہ دکھائی دیا اور وہ اسے تقویت دیتا تھا۔ پھر وہ حالت جان کنی میں اور بھی سرگرمی سے دعا کرنے لگا اور اس کا پسینہ موٹی موٹی بوندوں کی مانند ہو کر زمین پر ٹپکتا تھا جب وہ دعا سے اٹھ کر شاگردوں کے پاس آیا تو ان کو غم کی وجہ سے سوتے پایا اور ان سے کہا.....دعا کرو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو"

(لوقا۲۲:۳۹تا۴۶)

حیرانی ہوتی ہے کہ اتنی تصریحات کے باجود عیسائی آپ علیہ السلام کو قادر مطلق خدا یقین کرتے ہیں ایسا خدا جس کے قبضے میں سب کچھ ہے اور ایک پتہ بھی اس کی مشیت کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔

مسیحی کہتے ہیں کہ آپ نے گھٹنے ٹیک کر آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر بے کسی اور بے بسی کے عالم میں دعا ایک انسان کی حیثیت سے کی کیونکہ آپ تھے تو خدا لیکن تجسم کے بعد تمام انسانی صفات بھی اختیار کر لی تھیں اگر آپ بیک وقت خدا بھی تھے اور انسان بھی تو دشمنوں سے بچنے کے لئے خدائی طاقت خدائی مشیت کو کام میں لاتے اور جب وہ خوف کی حالت میں تھے تو خدائی صفت کو حرکت دے لیتے کسی سے مانگنے کی ساری رات عرض کرنے سے بچ جاتے ایک عام سی مثال ہے کہ ایک شخص کے پاس کھانا ہے اسے بھوک لگی ہے تو کیا وہ خود اس کا بندوبست کرے گا یا روٹی ہونے کے باوجود کسی دوسرے سے کھانا مانگے گا یقیناً یسوع علیہ السلام بچنا چاہتے تھے اسی لئے وہ دعا کر رہے تھے اگر وہ خود دعا قبول کرنے کی طاقت رکھتے تو دعا ہرگز نہ کرتے۔ پھر یہ کہنا کہ مسیح میں دو مشیتیں ہیں مسیح خود فرما رہے ہیں کہ مجھ میں خدائی مشیت نہیں "لیکن میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو" مشیت الٰہی اپنی الوھی حیثیت میں مشیت مسیح سے الگ ہے تب ہی تو فرما رہے ہیں اگر ہم کہیں کہ مسیح میں قربان ہونے کی مشیت بھی تھی تو گویا مسیح کہہ رہے تھے کہ میری مشیت پوری نہ ہو جو تیری مشیت بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تیری مشیت پوری نہ ہو دو متضاد صفات اور دو متضاد طبیعتیں ایک ذات میں محال عقلی ہیں۔ مسیحی خود اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن ہٹ دھرمی کا کیا علاج؟

۹۔ مرقس مسیح علیہ السلام کی دعا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا

ہے "اس نے اپنے شاگردوں سے کہا یہاں بیٹھے رہو جب تک میں دعا کروں اور پطرس اور یعقوب اور یوحنا کو اپنے ساتھ لے کر دہشت زدہ اور رنجیدہ ہونے لگا اور ان سے کہا میری جان بحد موت غمگین ہے تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو اور وہ تھوڑا آگے جا گرا اور دعا کی...... پھر چلا گیا اور وہی کہہ کر دعا کی"

(مرقس ۱۴: ۳۲ تا ۳۹)

خوف خدا

مسیح علیہ السلام چونکہ ایک انسان اور برگزیدہ نبی تھے اس لئے خوف خدا کی تعلیم دی بائبل میں ایسی کئی آیات ہیں جن میں آپ نے حکم دیا کہ اللہ سے ڈرو کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ چونکہ میں خدا ہوں اس لئے مجھ سے ڈرو آپ فرماتے ہیں

۱۔ اور ان سے مت ڈرو جو بدن کو قتل کرتے ہیں پر جان کو قتل نہیں کر سکتے بلکہ اس سے ڈرو جو جان اور بدن دونوں کو جنہم میں ہلاک کر سکتا ہے کیا پیسے کی دو چڑیاں نہیں بکتیں اور ان میں سے ایک بھی تمہارے باپ کی مرضی کے بغیر زمین پر نہیں گرتی بلکہ تمہارے سر کے بال بھی سب گنے ہوئے ہیں پس مت ڈرو تم بہت چڑیوں سے زیادہ قدر رکھتے ہو۔"

(متی ۱۰: ۲۸ تا ۳۱)

انسان صرف بدن کو قتل کر سکتا ہے روح تک اس کی رسائی نہیں۔ اور بدن کا قتل بھی مشیت الٰہی پر موقوف ہے چڑیوں جیسی حقیر یقین کی جانے والی کم قیمت پرندے کے جسم کا قتل بھی مشیت ایزدی کے بغیر ناممکن ہے مسیح اپنے مشن کی اشاعت کے لئے اپنے شاگردوں کو تعلیم دے

رہے ہیں ایک نبی کی سچائی کا عکس کس خوبصورتی سے نظر آرہا ہے ایک جگہ آپ شہادت کا شوق دلاتے ہوئے فرماتے ہیں "جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا لیکن جو میری خاطر اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔"

(متی ۱۰:۳۹)

یعنی یہ زندگی فانی ہے جو شخص اس فانی زندگی کو دوام دینا چاہتا اور اس مقصد کے لئے انسانوں سے خوف کھاتا ہے اس کی زندگی دوام حاصل نہیں کر سکتی لیکن جو شخص اس فانی زندگی کو مسیح علیہ السلام کے مشن کی کامیابی کے لئے قربان کر دیتا ہے اسے شہادت کے درجے پر فائز کر دیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ رہنے والی زندگی پالیتا ہے

نجات ایمان اور تقویٰ میں ہے:۔

مسیحیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی اختیار کر کے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ نجات یسوع کی صلیبی موت کو قبول کرنے میں ہے۔ شاید اسے کوئی الزام ٹھہرائے اس لئے اس عقیدہ کی دلیل پیش کر دینا مناسب ہو گا۔

وکلف اے سنگھ جو مسیحیت کے جید عالم ہیں۔ اپنی ایک کتاب "فضیلت، مسیح" کے ص ۱۰۲ پر "منجی جہاں" کے عنوان سے اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ انسان نجات کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے جن میں تزکیہ نفس، شریعت اور احکام الٰہی کی پابندی، اعمال حسنہ، توبہ اور رحم خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن ان تمام طریقوں سے نجات حاصل نہیں ہوتی نجات کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ انسان کفارہ پر ایمان

لائے۔ وہ لکھتے ہیں "نجات صرف یسوع المسیح کے کفارہ سے ہے"
(ص ۱۱۸)

کفارہ مسیح پر اس سے قبل تفصیلاً گفتگو ہو چکی ہے یہاں پر صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ مسیح علیہ السلام کی تعلیم یہ ہے کہ نجات ایمان اور تقویٰ میں ہے اور ایمان سے مراد ایمان بالکفارہ نہیں ہے۔

ایک فقیہ نے آپ کی آزمائش کے لئے پوچھا کہ اے استاد ہمیشہ کی زندگی کس میں ہے آپ نے اس سے کہا "کہ شریعت میں کیا لکھا ہے؟ تو کس طرح پڑھتا ہے؟ اس نے جواب میں کہا تو خداوند اپنے خدا کو اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری جان سے اور اپنی ساری عقل سے اور اپنے ہمسائے کو اپنی مانند پیار کر اس نے اس سے کہا تو نے ٹھیک جواب دیا یہی کر تو جئے گا۔"
(لوقا ۱۰: ۲۵، ۲۸)

یعنی ہمیشہ کی زندگی (نجات) شریعت کے احکام کی پابندی کرنے میں ہے۔ اور شریعت کا حکم یہ ہے کہ خدا پر یقین رکھ کر اس سے محبت کی جائے اور اس کی مخلوق سے بھی محبت کا سلوک روا رکھا جائے۔ آپ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ تو میری صلیبی موت پر ایمان لے آ تا کہ تو جیتا رہے بلکہ تورات کی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے ثابت کر دیا کہ نجات کا مشن اور طریقہ ہر دور میں یکساں رہا ہے۔

مسیح علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ میرا مشن انجیل کی تعلیمات کی اشاعت ہے جو شخص اس مشن میں میرا ساتھ دے گا اور تمام رشتوں ناتوں کو قربان کرے گا۔ وہی نجات حاصل کرے گا مرقس لکھتا ہے کہ مسیح علیہ

السلام نے فرمایا

۲۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں ایسا کوئی نہیں جس نے گھر یا بھائیوں یا بہنوں یا ماں باپ یا بال بچوں یا کھیتوں کو میرے لئے اور انجیل کے لئے چھوڑ دیا ہو۔ جواب میں اسی زمانے میں سو گنا نہ پائے۔ گھروں اور بھائیوں اور بہنوں اور ماؤں اور بال بچوں اور کھیتوں کو تصدیعوں کے ساتھ اور آنے والے زمانے میں ہمیشہ کی زندگی"

(مرقس ۱۰: ۲۹، ۳۰)

آیت میں نجات بالکفارہ کا کہیں ذکر نہیں۔ اور نجات کو شریعت کی پابندی سے معلق کیا گیا ہے۔

۳۔ یوحنا مسیح علیہ السلام کا قول نقل کرتا ہے کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر کوئی میرے کلام پر عمل کرے تو وہ ابدا" کبھی موت نہ دیکھے گا"

(یوحنا ۸: ۵۱)

انجیل مقدس میں تقویٰ اور پاکیزگی کی تعلیم ہے۔ گویا نجات ہمیشہ کی زندگی تقویٰ اور پاکیزہ زندگی پر موقوف ہے۔ نجات بالکفارہ کا کہیں ذکر نہیں۔

۴۔ مسیح علیہ السلام تقویٰ اور پرہیزگاری کو خزانہ جمع کرنے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور تلقین کرتے ہیں نیک اعمال کی جزاء جنت ہے۔

"اپنے واسطے زمین پر خزانہ جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقاب لگا کر چراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لئے آسمان پر خزانہ جمع کرو۔ جہاں نہ کیڑا، نہ زنگ خراب کرتا ہے اور نہ چور نقب لگا کر چراتے ہیں کیونکہ جہاں تیرا خزانہ ہے وہیں تیرا دل بھی ہو گا"

(متی ۶: ۱۹ تا ۲۱)

"خزانہ جمع کرنا" کی تفسیر فی سبیل اللہ ہو تو بھی نجات بالاعمال الحسنہ کا نظریہ ثابت ہوتا ہے، نہ کہ نجات با لکفارہ کا نظریہ، مسیح علیہ السلام کے نزدیک خلوص دل سے شریعت کی پابندی ہی نجات کا سبب بن سکتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"خبردار! اپنے راستی کے کام لوگوں کے سامنے دکھانے کے لئے نہ کرو نہیں تو تمہیں باپ کی طرف سے جو آسمان پر ہے اجر نہ ملے گا۔"

(متی ۶: ۱)

اجر کیا ہے؟ نجات اور بخشش ہی تو ہے۔ اور نجات اور بخشش راستی کے کاموں پر منحصر ہے جو صاف خدا کی خوشنودی کے لئے کئے گئے ہوں۔

۶۔ مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انسان کے اعمال کی بازپرس ہو گی اور ایک ایک پائی کا حساب ہو گا۔ گویا نجات اعمال صالح پر موقوف ہے۔ "میں تجھ سے کہتا ہوں کہ جب تک تو کوڑی کوڑی ادا نہ کرے گا۔ وہاں سے ہرگز نہ چھوٹے گا۔"

(لوقا ۱۲: ۵۹)

۷۔ آپ فرماتے ہیں کہ میری کامل اتباع ہی زندگی کا نور (نجات) ہے۔ "دنیا کا نور میں ہوں۔ جو میری پیروری کرے گا۔ وہ تاریکی میں نہیں چلے گا بلکہ زندگی کا نور پائے گا۔

(یوحنا ۸: ۱۲)

۸۔ یسوع علیہ السلام چاہتے ہیں۔ کہ ان کی باتوں پر قائم رہ کر ان کی محبت کا ثبوت مہیا کیا جائے اور اس طرح نجات کا حق حاصل کیا

جائے۔ اگر تم میری باتوں پر قائم رہو گے تو تم در حقیقت میرے شاگرد ہو گے۔ اور سچائی کو جانو گے اور سچائی تم کو آزاد کرے گی۔

(یوحنا۸: ۳۱' ۳۲)

۹۔ ایک مقام پر آپ ایمان کو ہمیشہ کی زندگی قرار دیتے ہیں۔

"جو ایمان لاتا ہے وہ ہمیشہ کی زندگی پاتا ہے"

(یوحنا۶: ۴۷)

ان آیات میں اور اس کے علاوہ کئی دوسری آیات میں تزکیہ نفس اور شریعت کی پابندی کو نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ کسی بھی آیت میں جس کی نسبت براہ راست مسیح علیہ السلام کی طرف ہو یہ نہیں کہا گیا کہ میں خود خدا تمہاری نجات کی خاطر انسانی جامہ ملبوس کر کے صلیب کے ذریعے نجات دینے آیا ہوں۔ ہمیشہ کی زندگی' نور ابدی زندگی نجات کے مترادف ہیں۔ یسوع علیہ السلام نے ایمان باللہ ایمان بالرسالتہ اور نیک اعمال کو نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے قیامت کے دن کئی لوگ مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے کا دعویٰ کریں گے لیکن مسیح انہیں ٹھکرا دیں گے۔

اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے ایک ایسی آیت پیش کرتا ہوں جس میں صراحت سے نجات بالاعمال الحسنہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعقوب اپنے خط میں لکھتا ہے "اے میرے بھائیو! اگر کوئی کہے کہ میں ایماندار ہوں مگر عمل نہ کرتا ہو تو کیا فائدہ؟ کیا ایمان اسے نجات دے سکتا ہے؟ اگر کوئی بھائی یا بہن ننگی ہو اور ان کو روزانہ کی روٹی کی کمی ہو اور تم میں کوئی ان سے کہے کہ سلامتی کے ساتھ جاؤ۔ گرم اور سیر رہو مگر جو چیزیں تن کے لئے درکار ہیں وہ انہیں نہ دیں تو کیا فائدہ۔ اسی طرح ایمان بھی اگر اس کے ساتھ اعمال نہ ہوں تو اپنی ذات سے مردہ ہے..... کیا تو یہ نہیں جانتا کہ

ایمان بغیر اعمال کے بیکار ہے۔"

(یعقوب ۲: ۱۴ تا ۲۰)

اہل اسلام کا بھی یہی نظریہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح ذریعہ نجات ہے۔

ایمان بغیر اعمال کے بیکار ہے"۔

(یعقوب ۲: ۱۴ تا ۲۰)

اہل اسلام کا بھی یہی نظریہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح ذریعہ نجات ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کی نورانی تعلیمات

صلائے فقر

سیدنا مسیح علیہ السلام کی پوری زندگی فقر سے عبارت ہے آپ نے دنیوی جاہ و حشمت کو پرکاہ کی بھی حیثیت نہ دی۔ آپ کا خاندان بڑھئی کے پیشے سے منسلک تھا اور بائیبل کی رو سے آپ نے اپنی جوانی تک اسی پیشہ کو اختیار کئے رکھا۔ آپ علیہ السلام کا فقر اختیاری تھا۔ اضطراری نہیں تھا۔ آپ چاہتے تو دولت آپ کے قدم چومتی لیکن آپ دنیاوی مال متاع کو راہ کا روڑا یقین کرتے تھے۔ نہ صرف آپ نے فقر کی زندگی کو خود ترجیح دی بلکہ اپنے ماننے والوں کو بھی فقر کی زندگی اختیار کرنے کی تعلیم دی۔

۱۔ آپ نے تمثیلی انداز تبلیغ اختیار فرمایا۔ اور اپنے ارد گرد کی

علامات کو ابلاغ کا ذریعہ بنایا۔ دو مالکوں کی تفصیل بیان کر کے فقر کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں "تم خدا اور دولت دونوں کی غلامی نہیں کر سکتے"

(متی ۶: ۲۴)

۲۔ پرندوں اور سوسنوں کی تمثیل بیان فرما کر یہ احساس دلاتے ہیں کہ رزق کا ذمہ اللہ نے لے لیا ہے۔ پرندے ذخیرہ نہیں کرتے۔ صبح اٹھ کر زمین پر پھیل جاتے ہیں اور انہیں رزق مل جاتا ہے سوسن کا پودہ زمین سے بغیر کوشش کے خوراک حاصل کر لیتا ہے انسان کو اللہ پر توکل کرنا چاہئے اس تمثیل کے بعد فرماتے ہیں۔ "پس کل کے دن کے لئے فکر نہ کرو"

(متی ۶: ۳۴)

۳۔ ایک امیر آدمی نے آخری نجات کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "جا اور اپنا سب کچھ بیچ ڈال اور غریبوں کو عطا کر۔ تو تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا۔ اور آکر میرے پیچھے ہو لے۔"

(مرقس ۱۰ تا ۲۱)۔

۴۔ دنیا کی بضاعتیں و آخرت کی بقاء کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں اور آخرت کی بہتری کے لئے انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین کرتے ہیں۔

"اپنے واسطے زمین پر خزانہ جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگا کر چراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لئے آسمان پر خزانہ جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے اور نہ چور نقب لگا کر چراتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تیرا خزانہ ہے وہیں تیرا دل بھی ہو گا۔"

(متی ۶: ۱۹ تا ۲۱)

۵۔ حضرت مسیح علیہ السلام ایک نادان ساھوکار کی تفصیل بیان فرماتے ہیں۔ اس ساھوکار کے پاس اس قدر غلہ ہوا کہ رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ اس نے چھوٹے چھوٹے مکانات کو گرا کر بڑے مکانات بنائے اور پوری فصل ذخیرہ کر دی اور سوچا کہ اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ پوری زندگی عیش سے بسر ہو گی لیکن وہ اسی دن مر گیا۔ اور اس کی دولت نے اسے کوئی فائدہ نہ دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں

"ایسا ہی وہ ہے جو اپنے لئے خزانہ جمع کرتا ہے اور خدا کے نزدیک دولتمند نہیں"

(لوقا ۱۲: ۱۶ تا ۲۱)

۶۔ اسی باب میں اپنے شاگردوں کو تلقین کرتے ہیں

"اے چھوٹے گلے نہ ڈرو کیونکہ تمہارے باپ کو پسند آیا کہ بادشاہی تمہیں دے۔ اپنا مال و اسباب بیچ ڈالو اور خیرات دو۔ اپنے لئے ایسے بٹوے بناؤ جو پرانے نہیں ہوتے یعنی آسمان پر ایک نا ممکن الزوال خزانہ.....

(لوقا ۱۲: ۳۲، ۳۳)

لوگوں نے جب مسیح علیہ السلام کے معجزات کو دیکھا تو آپ کی راہ پر گامزن ہونے کی التجا کی۔ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں۔ کہ برج بنانے سے پہلے اخراجات کا حساب کر لینا ضروری ہے۔ اسی طرح جنگ سے پہلے بادشاہ دشمن کی طاقت کا خوب اندازہ کر لیتا ہے تم بھی میری تقلید سے پہلے خوب سوچ لو۔ آپ فرماتے ہیں

"جو کوئی تم میں اپنا سب کچھ ترک نہ کرے میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔"

(لوقا ۱۴: ۳۳)

۸۔ آپ علیہ السلام کا یہ معمول تھا کہ کثرت سے بارگاہ خداوندی میں دعا کرتے۔ آپ کے شاگردوں نے عرض کی کہ انہیں بھی دعا کرنے کا طریقہ سکھایا جائے۔ آپ نے اس دعا میں یہ الفاظ بھی تعلیم فرمائے "ہمارے روزینے کی روٹی روزمرہ ہمیں دیا کر"

(لوقا ۱۱: ۳)

رسول کریم ﷺ نے حضرت ابوہریرہ کو بھی یہ الفاظ تعلیم فرمائے "پاک اور حلال کماؤ، نیک کام کرو، اللہ تعالیٰ سے ہر دن کو دن ہی کی روزی مانگو اور اپنے آپ کو مردوں میں سمجھو"

(بحوالہ مکاشفہ القلوب۔ ص ۲۱۹)

۹۔ ایک شخص نے التجا کی کہ اے حضور المسیح مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ آپ نے فرمایا "لومڑیوں کی ماندیں ہیں اور پرندوں کے لئے گھونسلے مگر ابن انسان کے لئے اتنی بھی جگہ نہیں جہاں سر رکھے۔"

(لوقا ۹: ۵۸)

" ایک شخص نے حضور المسیح علیہ السلام سے پوچھا کہ "میں کونسی نیکی کروں تاکہ ابدی زندگی پاؤں" آپ نے تورات کی ایک آیت کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ اس شخص نے عرض کی شریعت پر تو میں پہلے سے عمل کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا

"اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا سب کچھ بیچ ڈال اور غریبوں کو دے" اس ضمن میں اناجیل مقدسہ کی سینکڑوں آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ فقر کی تعلیم تمام انبیاء علیہ السلام اور رسول کریم ﷺ کی تعلیم میں ہے۔ اتنی مطابقت شاید ہی کہیں ہو۔ رسول کریم ﷺ نے حضرت مسیح

علیہ السلام کی کئی فرامین کو بیان فرمایا ہے۔ کچھ تو اناجیل متداولہ میں مل جاتے ہیں اور کچھ ان میں مذکور نہیں ہیں۔

غریب پروری

سیدنا مسیح علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل رومی حکومت کے زیر تسلط غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک طرف تو حکومت کے کارندے تھے جو محصول کے نام پر غریبوں کی کمائی پر ہاتھ صاف کر رہے تھے اور دوسری طرف علماء شرع جو نذرانوں کی آڑ میں غریب کی مزدوری کو اپنی عیاشیوں کی نذر کر رہے تھے۔ فقیر نبی حضرت مسیح علیہ الصلوۃ والسلام نے دونوں گروہوں کو خبردار کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ غریب طبقہ کی دستگیری فرمائی اور انہیں اپنے شاگردوں کے برابر جگہ عنایت کی۔ آپ کی مجلس میں امیر اور غریب برابر تھے۔

ا۔ فریسی فرقہ کے ایک یہودی عالم نے آپ کو کھانے پر بلایا۔ اس دعوت میں کئی دوسرے علماء اور فقہاء بھی شامل تھے۔ آپ ان علماء کو ان کے کرتوتوں پر ٹوکتے تھے اور من گھڑت آبائی روایات کی پیروی سے روکتے تھے۔ اس لئے یہ لوگ آپ کی مخالفت کرتے تھے اور اس تاڑ میں رہتے کہ کہیں آپ سے کوئی غلطی سرزد ہو کہ اسے بنیاد بنا کر اعتراض کریں۔ اس معصوم عن الخطاء نبی سے غلطی کیا سرزد ہوتی۔ جب کسی آبائی روایت کے خلاف ورزی ہوتی اعتراض کر دیتے۔

اس دعوت میں بھی ایک مستقی کی شفاء پر اعتراض ہوا لیکن آپ کے حکمت بھرے جواب سے خاموش ہو گئے آپ نے میزبان کو غریب پروری کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا

"جب تو چاشت یا عشاء کی تیاری کرے تو اپنے دوستوں یا بھائیوں یا رشتہ داروں یا دولتمند پڑوسیوں کو نہ بلا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی تجھے بلائیں۔ اور تیرا بدلہ ہو جائے بلکہ جب تو ضیافت کرے تو غریبوں' لنجوں' لنگڑوں اور اندھوں کو بلا۔ اور تو مبارک ہو گا کیونکہ ان کے پاس کچھ نہیں کہ تجھے بدلہ دیں۔ مگر تجھے راستبازوں کی قیامت میں بدلہ دیا جائے گا۔"

(لوقا ۱۴: ۱۲ تا ۱۴)

حضور سیدنا المسیح علیہ السلام کے ارشادات عالیہ کو سننے کے لئے لوگ جوق در جوق حاضر ہوتے اور اس باکمال تعلیم کو سن کر اس قدر مسحور ہوتے کہ دنوں پر دن بیتتے چلے جاتے لیکن واپسی کا نام نہ لیتے۔

ایک گروہ مسیح علیہ السلام کی تعلیمات سے مستفید ہونے کے لئے تین دن سے برابر آپ کے ساتھ تھا۔ آپ سے ان کی حالت زار دیکھی نہ گئی۔ اور حواریوں کو حکم دیا

"مجھے ہجوم پر ترس آتا ہے کیونکہ یہ تین دن سے برابر میرے ساتھ ہے۔ اور ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ میں انہیں بھوکا ان کے گھر جانے کے لئے رخصت کر دوں تو راہ میں ماندے پڑ جائیں گے۔ کیونکہ بعض ان میں سے دور سے آئے ہوئے ہیں۔"

(مرقس ۸: ۱ تا ۳)

شاگردوں نے عرض کی حضور تقریباً چار ہزار کے اس مجمع کو روٹی کہاں سے دی جائے گی۔ آپ نے پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے انہوں نے عرض کی کہ صرف سات روٹیاں ہیں اور کچھ تھوڑی سی چھوٹی مچھلیاں۔ آپ نے روٹی لے کر اس کے ٹکڑے کر دیے اور شاگردوں کو فرمایا کہ یہ روٹیاں ہجوم کے آگے رکھتے جاؤ روٹی میں برکت آگئی ہجوم نے سیر ہو کر

کھایا اور ٹکڑوں کے سات ٹوکرے بچ گئے۔

۳۔ آپ نے غریب پروری کے وہ نمونے پیش کئے جسے دیکھ کر زرپرست منہ چھپانے لگے۔ اور انسانیت پر فرشتے رشک کرنے لگے۔

ایک دفعہ لوگ ہیکل کے خزانے میں چندہ ڈال رہے تھے۔ امراء اپنی دولت کی نمائش کی غرض سے خطیر رقم ڈال رہے تھے۔ حضرت مسیح یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک کنگال بیوہ آئی۔ اور دو پیسے کا نکا ڈال دیا۔ آپ نے شاگردوں کو بلایا اور فرمایا

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو خزانے میں ڈالتے رہے تھے۔ ان سب سے زیادہ اس کنگال بیوہ نے ڈالا ہے۔ کیونکہ سب اپنی بہتات میں سے ڈالتے ہیں۔ مگر اس نے اپنی غریبی سے اپنا سب کچھ یعنی اپنی ساری پونجی ڈال دی۔"

(مرقس ۱۲: ۴۳، ۴۴)

۴۔ مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں میری بعثت کا مقصد کھوئے ہوؤں کو بچانا ہے "خبردار ان چھوٹوں میں سے کسی کو ناچیز نہ جانو۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ آسمان پر ان کے فرشتے میرے باپ کا جو آسمان پر ہے منہ ہمیشہ دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ابن انسان اس لئے آیا ہے کہ کھوئے ہوئے بچائے۔"

(متی۔ ۱۸: ۱۰، ۱۱)

۵۔ مسیح علیہ السلام اپنے میدانی وعظ میں فرماتے ہیں

"مبارک ہو تم جو غریب ہو۔ کیونکہ خدا کی بادشاہی تمہاری ہے۔ مبارک ہو تم جو اب بھوکے ہو کیونکہ سیر کئے جاؤ گے مبارک ہو تم جو روتے ہو۔ کیونکہ ہنسو گے......

مگر افسوس تم پر جو دولتمند ہو کیونکہ تم اپنی تسلی پا چکے۔ افسوس تم پر جو اب سیر ہو کیونکہ بھوکے ہو گے۔

افسوس تم پر جو اب ہنستے ہو۔ کیونکہ ماتم کرو گے اور روؤ گے۔"

(لوقا ۶: ۲۰ تا ۲۵)

عفو درگزر

سالہا سال کی غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل میں غلام قوم کی بہت سی قباحتیں رچ بس چکی تھیں۔ ایک طرف تو لوگ ایسے تھے جو رومی سلطنت کے اشارہ ابرو پر دین کی تعلیمات تک کو پس پشت ڈالنے پر آمادہ دکھائی دیتے تھے۔ اور دوسری طرف وہ انتہا پسند تھے جو ہر اٹھنے والی شخصیت کو رومی حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لئے بادشاہ بنانے پر تیار ہو جائے۔ اسی انتہا پسندی کا نتیجہ تھا کہ انبیاء کی طرف ایسی تعلیمات منسوب کر دیں جو ظلم پر مبنی تھیں۔ مثلاً ایک شخص کے بدلے ہزاروں کا قتل فاتح قوم کا معصوموں کو بھی تیغ کرنا وغیرہ۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا مقصد چونکہ خدائی بادشاہت کو رواج دینا تھا اس لئے آپ نے اعتدال کی تعلیم دی۔ اگر کہیں افراط و تفریط کی تعلیم ہے تو یقیناً مسیح علیہ السلام کی طرف غلط نسبت کا شاخسانہ ہے۔

ا۔ آپ عفو درگزر کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اگر تم آدمیوں کو نہیں بخشو گے تو تمہارا باپ تمہارے قصور نہیں بخشے گا۔"

(متی ۶: ۱۴، ۱۵)

آپ علیہ السلام کے مشہور حواری حضرت پطرس نے دریافت کیا

کہ "اے خداوند کتنی دفعہ میرا بھائی میرے گناہ کرے اور میں اسے معاف کروں کیا سات دفعہ؟ یسوع نے اسے کہا۔ میں تجھ سے یہ نہیں کہتا کہ سات دفعہ بلکہ ستر بار تک"

(متی ۱۸: ۲۱، ۲۲)

پھر آپ علیہ السلام نے اسے ایک تمثیل کے ذریعے واضح کیا۔ ایک قرض خواہ بادشاہ کے سامنے ایک ایسا مقروض لایا گیا جس پر دس ہزار قنطار کا قرض تھا۔ خادم کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ تھا۔ جس پر اس نے بادشاہ کی منت کی اور بادشاہ نے اسے قرض معاف کر دیا۔ لیکن اس بدبخت خادم نے ایک غریب سے قرض کے سو دینار کا سختی سے تقاضا کیا اور منت کرنے پر بھی اسے معاف نہ کیا۔ جب بادشاہ کو اس کی خساست کا علم ہوا تو اسے جلادوں کے حوالے کر دیا۔

یسوع علیہ السلام فرماتے ہیں بخشش چاہتے ہو تو اپنے ہم جنسوں کو معاف کرو۔

۳۔ مسیح علیہ السلام اپنے شاگردوں سے فرماتے ہیں۔

"خبردار رہو اگر تیرا بھائی گناہ کرے تو اسے ملامت کر۔ اگر توبہ کرے تو اسے معاف کر۔ اور اگر وہ ایک دن میں سات بار تیرا گناہ کرے اور سات بار تیرے پاس پھر آکر کہے کہ میں توبہ کرتا ہوں تو اسے معاف کر۔"

(لوقا ۱۷: ۳، ۴)

عفو درگزر کی تعلیمات انجیل میں جگہ جگہ ملتی ہیں بعض مقامات پر مسیح علیہ السلام کی طرف غلط تعلیمات بھی منسوب کی گئی ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے۔ ایسی تعلیمات کی ترویج فساد فی الارض کا موجب بن

سکتی ہیں۔ قوت کے توازن کو برقرار رکھنے کی خاطر فساد کے مرتکب ظالموں کے ظلم کا جواب دینا بہتر ہے۔ تاکہ فتنہ پھیلنے نہ پائے۔ مسیحی دنیا بھی اس قضیہ پر کبھی بھی عمل پیرا نہیں رہی۔ کہ اگر کوئی ایک گال پر تمانچہ مارے تو دوسرا گال پیش کر دو اور اگر کوئی ایک کوس تک بیگار لے جائے تو دو کوس تک اس کے ساتھ جاؤ۔ ایسا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مناسب ہے۔ ناممکن اور خلاف عقل تعلیمات یونانی فلسفہ کی مرہون منت ہیں اسی لئے انہیں آسانی سے بائیبل میں الگ کیا جا سکتا ہے۔

ریاکاری کی ممانعت

ریاکاری ایک ایسی دیمک ہے جو زندگی کی پوری محنت کو چاٹ جاتی ہے۔ ایک انسان محض اپنے نفس کی پیروی میں سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔ ریاکاری دراصل احساس کا گناہ ہے۔ اور احساس کا گناہ عملی گناہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ اسلام آدم علیہ السلام سے لے کر محمد خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی کی وساطت سے ریاکاری اور دکھاوے کی ممانعت کرتا ہے۔

حضرت سیدنا مسیح علیہ السلام کی تعلیمات میں ریاکاری کی ممانعت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اناجیل مقدسہ کی کئی آیات کریمہ اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ا۔ مقدس متی حضرت مسیح روح اللہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں۔

"خبردار! اپنے راستی کے کام لوگوں کے سامنے دکھانے کے لئے نہ کرو نہیں تو تمہارے باپ کی طرف سے جو آسمان پر ہے تمہیں اجر نہیں

ملے گا

(متی ۶: ۳'۴)

انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ریاکار کو اس کا وہی بدلہ دیا جائے جس کی اسے تمنا ہے۔ اس کا مقصد چونکہ دنیاوی عزت ہے۔ اس لئے وہ صلہ اسے مل جاتا ہے اگر اس کی نیکی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہوتا تو یقیناً اللہ اسے اخروی صلہ بھی عطا کرتا۔

خیرات کو مسیح علیہ السلام کی تعلیمات میں اہم مقام حاصل ہے۔ لیکن آنحضرت نے جب بھی صدقہ و خیرات کی تلقین کی تو ساتھ اخلاص کی اہمیت اور ریاکاری کی ہلاکت خیزی کو بھی بیان فرمادیا۔ تاکہ یہ عمل نمود و نمائش کا ذریعہ اور غرباء و مساکین کی ذلت کا سبب نہ بن کر رہ جائے۔ آپ نے فرمایا۔

"پس جب تو خیرات کرے تو اپنے سامنے ترہی مت بجوا۔ جیسے ریاکار عبادت خانوں اور کوچوں میں کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی تعریف کریں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پاچکے۔ مگر جب تو خیرات کرے تو جو تیرا دہنا ہاتھ کرتا ہے اسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے تاکہ تیری خیرات پوشیدہ رہے اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔"

(متی ۶: ۲ تا ۴)

۳۔ دعا اللہ تعالیٰ سے سرگوشی اور ہم کلامی کی کیفیت حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن ریاکاری کی اس کیفیت کو لوٹ لیتی ہے۔ اور اسے محض الفاظ کا گورکھ دھندا بنا ڈالتی ہے۔ مسیح علیہ السلام نے اس لعنت سے اجتناب کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا۔ "اور جب تم دعا کرو تو ریاکار کی مانند نہ ہونا۔ کیونکہ وہ عبادت خانوں میں اور بازاروں کے موڑوں پر

کھڑے ہو کر دعا کرنا پسند کرتے ہیں تاکہ لوگ انہیں دیکھیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ مگر جب تو دعا کرے تو اپنی کوٹھڑی میں جا اور دروازہ بند کر کے اپنے باپ سے پوشیدگی میں دعا کر اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔"

(متی ۶:۵'۶)

حضرت مسیح علیہ السلام کی شریعت میں بھی روزہ فرض تھا۔ لیکن عیسائی اسے محض نفس کشی اور رحمت خداوندی کو ملتفت کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اسے فرض نہیں سمجھتے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کثرت سے روزہ رکھتے تھے آپ نے اس عبادت کو بھی خلوص نیت سے ادا کرنے پر زور دیا اور ریاکاری سے ممانعت کی۔ فرمایا

"اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ انہیں روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ لیکن جب تو روزہ رکھے' سر پر تیل لگا اور منہ دھو۔ تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔"

(متی ۶:۱۶ تا ۱۸)

مسیح علیہ السلام کے معاصر یہودی علماء و فقہا دین کی تعلیمات سے انحراف کر کے شاہانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی سادہ اور درویشانہ زندگی سے انہیں کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا۔ حضرت روح اللہ علیہ السلام نے انہیں خبردار کیا اور لوگوں کو ان کی اتباع سے روکا۔ فرمایا "ان کے سے کام نہ کرو......وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے واسطے کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے تعویز چوڑے اور

اپنے پھندے بڑے بناتے ہیں۔ وہ ضیافتوں میں صدر نشین اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں کورنشات اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں مگر تم ربی نہ کہلاؤ کیونکہ تمہارا مرشد ایک ہے اور تم سب بھائی بھائی ہو۔

(متی ۲۳: ۳ تا ۸)

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۤؤُنَ○

کی آیت میں ریاکار نمازیوں کے لئے ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے ایسی ہی وعید مسیح علیہ السلام کی تعلیمات میں بھی موجود ہے اور قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے۔ مسیح علیہ السلام نے علماء شرع کو ریاکاری سے اجتناب کرنے کی تلقین فرمائی اور نہایت ہی زوردار انداز اختیار فرمایا۔ ارشاد ہوا۔

"تم پر افسوس! اے فقیہو اور فریسیو۔ اے ریاکارو جو بیواؤں کے گھروں کو نگلتے ہو اور دکھاوے کے لئے نمازوں کو طول دیتے ہو۔ تم اس لئے زیادہ سزا پاؤ گے"

(متی ۲۳: ۱۴)

۷۔ تم پر افسوس! اے فقیہو اور فریسیو۔ اے ریاکارو کیونکہ تم تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو تاکہ کسی کو اپنا مرید بناؤ اور جب وہ بن چکا تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بناتے ہیں"

(متی ۲۳: ۱۵)

۸۔ تم رکابی اور پیالے کو باہر سے تو صاف کرتے ہو مگر اندر لوٹ اور بدپرہیزی بھری ہے۔ اے نابینا فریسی پہلے پیالے اور رکابی کو اندر

سے صاف کر تاکہ باہر سے بھی صاف ہو جائیں۔

(متی ۲۳:۲۵)

تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو باہر سے خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔

(متی ۲۳:۲۸)۔

عیب جوئی کی ممانعت

جب آدمی دوسروں کی غلطیوں کی طرف دھیان دیتا ہے تو اپنی غلطیاں نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ انسان اپنی ذات کا محاسبہ کرے تو بہتر ہے عیب جوئی سے دلوں میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اخلاقیات میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ مسیح علیہ السلام کی تعلیمات میں عیب جوئی کی ممانعت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

۱۔ "عیب نہ لگاؤ تاکہ تم پر عیب نہ لگایا جائے۔ کیونکہ جس طرح تم عیب لگاتے ہو اسی طرح تم پر بھی عیب لگایا جائے گا۔ اور جس طرح پیمانے سے تم ناپتے ہو اسی سے تمہارے واسطے بھی ناپا جائے گا۔ اور اس تنکے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے۔ کیوں دیکھتا ہے اور اس شہتیر کا خیال نہیں کرتا جو تیری اپنی آنکھ میں ہے۔ یا کیونکہ تو اپنے بھائی سے کہہ سکتا ہے کہ ٹھہر میں اس تنکے کو جو تیری آنکھ میں ہے۔ نکال دوں اور دیکھ خود تیری آنکھ میں شہتیر ہے اے ریاکار پہلے شہتیر کو اپنی آنکھ سے نکال لے تب اس تنکے کو اپنے بھائی کی آنکھ سے اچھی طرح دیکھ کر نکال سکے گا۔"

(متی ۷: ۱ تا ۵)

۲۔ اگر کوئی شخص اپنے بھائی کے عیب سے آنکھیں موند لیتا ہے۔

تو قیامت کے دن اس عیب کی پردہ پوشی ہو گی۔ اور جو پردہ دری کرتا ہے اس کی بھی پردہ دری کی جائے گی۔ مسیح علیہ السلام اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں "عیب نہ لگاؤ۔ تو تم پر بھی عیب نہ لگایا جائے گا۔ مجرم نہ ٹھہراؤ تو تم بھی مجرم نہ ٹھہرائے جاؤ گے۔"

(لوقا ۶: ۳۷)

۳۔ المرء یقیس علی نفسہ کے بموجب ایک برا آدمی ہی اس قباحت کا ارتکاب کرتا ہے شریف اور نجیب لوگوں سے دوسرے انسانوں کی عزت محفوظ رہتی ہے۔

مسیح علیہ السلام اس حقیت کو ایک تمثیل کے ذریعے عیاں فرماتے ہیں۔ "کوئی اچھا درخت نہیں جو ردی پھل لائے اور نہ ہی کوئی ردی درخت ہے جو اچھا پھل لائے پس ہر ایک درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے لوگ خاردار جھاڑیوں سے انجیر نہیں توڑتے اور نہ جھڑبیری سے انگور۔ اچھا آدمی اپنے دل کے اچھے خزانے سے اچھی چیزیں نکالتا ہے اور برا آدمی برے خزانے سے بری چیزیں باہر لاتا ہے۔ کیونکہ جس سے دل لبریز ہے وہی منہ پر آتا ہے"

(لوقا ۶: ۴۳ تا ۴۵)

عاجزی وانکساری

عاجزی انسانیت کا زیور ہے مذاہب کی تعلیمات میں اس پر بہت

زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بندہ محتاج ہے اسے کبر و نخوت زیب نہیں دیتا۔ یہ رداء تو صرف بارگاہ ایزدی کے لئے زیبا ہے۔ اسے چھیننے کی کوشش کرنا سرکشی ہے۔ مسیح علیہ السلام نے پوری زندگی ایک عاجز بندۂ خدا کی زندگی بسر کی اور دوسروں کو بھی انسانیت کے دائرے میں رہنے کی تلقین کی۔

۱۔ مسیح علیہ السلام ایک تمثیل بیان کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

"دو شخص ہیکل میں دعا کرنے گئے۔ ایک فریسی دوسرا محصل۔ فریسی کھڑا ہو کر اپنے جی میں یوں دعا کرنے لگا۔ کہ اے خداوند میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ میں باقی آدمیوں جو لٹیرے، ظالم، زناکار ہیں یا محصل کی مانند نہیں ہوں۔ میں ہفتہ میں دو بار روزہ رکھتا ہوں اور اپنی ساری آمدنی پر دہ یکی دیتا ہوں۔ مگر اس محصل نے دور کھڑے ہو کر اتنا بھی نہ چاہا کہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھائے بلکہ چھاتی پیٹ پیٹ کر کہتا تھا کہ اے خدا مجھ گناہ گار پر رحم کر۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ شخص دوسرے کی نسبت راستباز ٹھہر کر اپنے گھر گیا کیونکہ جو کوئی اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا۔ وہ بڑا کیا ہو جائے گا"

(لوقا ۱۸: ۹ تا ۱۴)

۲۔ حواریوں میں یہ بات چل نکلی کہ آیا بڑا کون ہے۔ یسوع علیہ السلام نے ایک بچہ لے کر ان کو بتایا کہ اس بچے کی مانند اپنے آپ کو چھوٹا سمجھو یعنی عاجزی سے کام لو تو عزت پاؤ گے۔

"جو تم سب میں چھوٹا ہے وہی بڑا ہے"

(لوقا ۹: ۴۸، متی ۱۸: ۴)

۳۔ نہ صرف مسیح علیہ السلام نے عاجزی کی زبانی تعلیم دی بلکہ عملاً بھی اس کی تعلیم فرمائی۔ یوحنا لکھتا ہے

"اس نے کھانے سے اٹھ کر اپنا لباس اتارا اور ایک کتانی کپڑا لے کر اپنی کمر میں باندھا اور اس کے بعد باسن میں پانی ڈال کر شاگردوں کے پاؤں دھوئے اور جو کتانی کپڑا کمر میں باندھا تھا اس سے پونچھنے لگا۔

(۱۳: ۴، ۵)

پطرس ہچکچایا لیکن آپ نے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرلوں تو تیرا میرے ساتھ حصہ نہ ہو اس قسم کی وجہ سے پطرس خاموش ہو گیا۔ اور یکے بعد دیگرے تمام کے پاؤں دھوئے اور پھر فرمایا "تم مجھے استاد اور خداوند کہتے ہو اور خوب کہتے ہو کیونکہ میں ہوں جب میں نے استاد اور خداوند ہو کر تمہارے پاؤں دھوئے تو چاہئے کہ تم بھی ایک دوسرے کے پاؤں دھویا کرو اس لئے میں نے تمہیں نمونہ دیا ہے......"

(یوحنا ۱۳: ۱۳ تا ۱۵)

محبت

حضرت سیدنا مسیح روح اللہ علیہ الصلوۃ والسلام کی تعلیمات میں محبت کی تعلیم نمایاں نظر آتی ہے۔ نفرتوں کی اس دنیا میں محبت کی کرن پھوٹی تو مجبور و مقہور انسان پروانہ وار بڑھے۔ مسیح علیہ السلام اور آپ کے پاکیزہ حواری سراپا محبت تھے۔ اسی لئے نفرزدوں کا مجمع لگا رہتا۔ کوئی آپ کے سر پر تیل ملتا اور کوئی پاؤں دھو کر پیتا اور سجدہ تعظیم بجا لاتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے نفرتوں کو مٹانے اور محبت کی شمع جلانے کو اولیت دی

۱۔ اللہ تعالیٰ کے احسانات بے شمار ہیں۔ وہ انسانوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس لئے وہ محبت کا حق رکھتا ہے۔ قرآن کریم نے ایمان والوں کی

پہچان اللہ سے کمال محبت بتائی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ
حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے کمال محبت کی تعلیم دی ہے۔

۲۔ ایک یہودی عالم نے آزمائش کی غرض سے مسیح علیہ السلام سے دریافت فرمایا "اے استاد! میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں؟" آپ نے اس کے خبث باطن کو محسوس کرکے دریافت کیا کہ "توراۃ میں کیا لکھا ہے۔" اس نے جواب دیا "اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔" آپ نے فرمایا "تونے ٹھیک جواب دیا۔ یہی کر تو جیتا رہے گا۔"

(لوقا ۱۰: ۲۵ تا ۲۸)

فانی سے محبت فنا کر دیتی ہے۔ اور باقی سے محبت بقا بخشتی ہے۔ اس لئے جو اولیاء اللہ کے زمرے میں آجاتے ہیں ان کی آخرت کا لمحہ لمحہ زندگی سے عبارت ہو جاتا ہے اور موت ان کے لئے صبح دوام زندگی کا روپ دھار لیتی ہے۔ مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ کی محبت سے سرشار لوگ محبت مشرب بن جاتے ہیں۔ اور دعوئی دار نفرتوں کے سوداگر۔"

"اگر کوئی کہے کہ میں خدا سے محبت رکھتا ہوں اور اپنے بھائی سے عداوت رکھے تو جھوٹا ہے کیونکہ جو بھائی سے جسے اس نے دیکھا ہے محبت نہیں رکھ سکتا وہ خدا سے بھی جسے اس نے نہیں دیکھا محبت نہیں رکھ سکتا۔"

(یوحنا ۴: ۲۰)

۳۔ مسیح روح نے حواری کی پہچان محبت کو قرار دیا فرمایا ایک

دوسرے کو پیار کرو۔ جیسا میں نے تم کو پیار کیا اگر تم بھی ایسا ہی ایک دوسرے کو پیار کرو گے تو اس سے سب جانیں گے کہ تم میرے شاگرد ہو"

(یوحنا ۱۳: ۳۴، ۳۵)

۴۔ یسوع علیہ السلام نے صرف ترغیب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ محبت کو فرض کر دیا۔ "میں تمہیں یہ حکم دیتا ہوں کہ تم ایک دوسرے کو پیار کرو۔"

(یوحنا ۱۵: ۱۷)

۵۔ مسیح علیہ السلام نے تو محبت انسانی کو عبادت پر ترجیح دی ہے۔ فرمایا "پس اگر تو قربان گاہ کے پاس اپنی نذر لے جائے اور وہاں تجھے یاد آئے کہ میرے بھائی کو مجھ سے کچھ شکایت ہے تو اپنی نذر قربان گاہ کے سامنے چھوڑ کر چلا جا پہلے اپنے بھائی سے میل کر تب آ کے اپنی نذر گزران۔"

(متی ۵: ۲۳)

۶۔ محبت رضائے خداوندی کے حصول کے کا بہترین ذریعہ ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا "میں تم سے کہتا ہوں اگر تم میں سے دو شخص زمین پر اتفاق کریں تو وہ جو کچھ مانگیں گے وہ میرے باپ سے جو آسمان پر ہے حاصل کریں گے۔"

(متی ۱۸: ۱۹)

۷۔ پڑوسی کی خبر گیری اور محبت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کا محور ہے۔ اور پڑوسی انجیل میں وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مسیح علیہ السلام کے ایک ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جو ضرورت

مند ہے وہ آپ کا پڑوسی اور آپ کی محبت کا حق دار ہے (لوقا ۱۰: ۲۹ تا
۳۷) پڑوسی سے محبت کے متعلق آپ فرماتے ہیں۔

"اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ"

(متی ۱۹: ۱۹، لوقا ۱۰: ۲۷)

۸۔ حضرت روح اللہ علیہ الصلوۃ والسلام کے نزدیک صرف اپنے ہی محبت کے حقدار نہیں بلکہ دشمن بھی محبت کے حقدار ہیں۔ اپنوں سے تو محبت بھی کرتے ہیں۔ ارشاد گرامی ہے۔

"میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا کرو"

(متی ۵: ۴۴)

آخر میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسیحی حضرات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "اس (مسیح علیہ السلام) نے ذات الٰہی کے متعلق خدائے واحد خدائے محبت اور خدا باپ کا پدرانہ محبت کا جو عظیم تصور دیا ہے تمام مذاہب خدا کی اس عظیم پدرانہ محبت کے تصورات اور مکاشفہ سے محروم و بے خبر ہیں"

(تبصرہ انجیل برناباس۔ برکت اے خان ص ۴۷)

شاید برکت اے خان صاحب نے قرآن کریم کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ یہ دعویٰ ہرگز نہ کرتے قرآن کریم کی سینکڑوں آیات اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو استغفار کی تلقین کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی صفت مودّت کو مبالغہ کے صیغے سے بیان کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کی گفتگو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۔ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ

اے قوم اپنے رب سے مغفرت مانگو اور اس کی طرف لوٹو یقیناً میرا رب رحیم (رحمت کرنے والا) اور ودود (بے دریغ محبت کرنے والا) ہے۔ سورۃ بروج میں جزاء و سزا کے ذکر کے بعد اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ

اور وہ بہت بخشنے والا، بے پناہ محبت کرنے والا ہے۔

مسیحیت نے تو اللہ تعالیٰ کی محبت کو پدرانہ محبت کے پیمانے میں رکھ کر محدود کر دیا ہے قرآن تو مبالغے کے صیغے استعمال کر کے الٰہی محبت کی بے کرانیوں کا تصور دیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث پاک ہے جسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اَلَيْسَ اللّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنَ الْاُمِّ بِوَلَدِهَا۔ کیا اللہ اپنے بندوں پر ماں کی بچے پر رحمت سے زیادہ رحیم نہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں یہ درست ہے۔

مسیحیوں نے ابن اللہ کے لفظ سے شرک کا ارتکاب کیا ہے اور مسیح علیہ السلام کو خدا کے برابر قرار دے دیا ہے اس لئے شریعت محمدیہ نے اس لفظ کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ لیکن اللہ کی بے پایاں محبت کو بیان کرنے کے لئے الودود، الرحمٰن، الرحیم، الولی جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے باپ کے لفظ سے زیادہ محبت ظاہر ہوتی ہے۔

قیامت

ہر دور کے کفار نے قیامت کے وقوع سے انکار کیا ہے۔ سیدنا

عیسیٰ علیہ السلام کے مخالفین بنی اسرائیل میں بھی ایک فرقہ ایسا تھا۔ جو شریعت موسوی پر ایمان کے دعویٰ کے باوجود قیامت کا منکر تھا۔ عہد قدیم میں شاید اسی لئے بہت کم قیامت کے بارے تصور ملتا ہے۔ یہودیوں کے نزدیک نیکی کا صلہ غلبہ اور اقتدار ہو کر رہ گیا تھا۔ اور برائی' تباھی اور غلامی کا پیش خیمہ ہو کر گئی تھی۔ موت کے بعد دوبارہ زندگی اور نیکی و برائی پر صلہ اور سزا کا تصور ناپید تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے قیام قیامت کی تعلیم کو عام فرمایا۔ اناجیل اربعہ میں ایسی بہت ساری آیات ملتی ہیں۔

۱۔ مسیح علیہ السلام نے قیامت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا۔

"سورج تاریک ہو جائے گا اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور آسمان کے ستارے گریں گے اور جو قوتیں آسمان میں ہیں وہ ہلائی جائیں گی"

(مرقس ۱۳ تا ۲۴)

۲۔ جب آپ نے موت کے بعد جی اٹھنے کی تعلیم دی تو لوگ تعجب کرنے لگے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں' منتشر وجود اور معدوم شخصیت پھر سے اپنی پہلی حالت پر آجائے۔ آپنے فرمایا۔

"اس سے تعجب نہ کرو کیونکہ وہ وقت آتا ہے کہ جتنے قبروں میں ہیں اس کی آواز سنیں گے اور جنھوں نے نیکی کی ہے زندگی کی قیامت واسطے نکلیں گے اور جنھوں نے بدی کی ہے فتویٰ کی قیامت کے واسطے"

(یوحنا ۵: ۲۸ تا ۲۹)

قیامت کے دن راستبازوں اور مجرموں کو الگ الگ کر دیا جائے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزاء یا سزا دی جائے گی۔ مسیح علیہ

اور کاٹنے والے فرشتے ہیں۔ پس جس طرح زوان جمع کیا جاتا ہے۔ اور آگ میں جلایا جاتا ہے ایسا ہی دنیا کے آخر میں ہو گا۔"

(متی ۱۳: ۳۷ تا ۳۹)

۶۔ یسوع علیہ السلام نے قیامت کو کئی اور ناموں سے بھی موسوم کیا ہے۔ کہیں آپ آخری دن، کہیں بادشاہی کا دن اور کہیں عدالت کے دن کے الفاظ سے موسوم کرتے ہیں۔ مرقس کی انجیل کے مطابق تو مسیح علیہ السلام نے یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گرفتاری کے بعد جب ارشاد و تلقین کا بیڑا اٹھایا تو سب سے پہلے جس چیز سے آگاہ فرمایا وہ قیامت ہے۔ مرقس کہتا ہے۔

"یوحنا کی گرفتاری کے بعد یسوع جلیل میں آیا اور خدا کی بادشاہی کی خوشخبری کی منادی کی اور کہا کہ وقت پورا ہوا اور خدا کی بادشاہی نزدیک آگئی ہے۔ توبہ کرو اور انجیل پر ایمان لاؤ"

(مرقس ۱: ۱۵)

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ اسلام کی تعلیمات میں قیامت کی تعلیم بھر پور انداز میں موجود ہے اہل اسلام اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ تفصیلات میں اختلاف ہے۔ مسیحیوں کے نزدیک جتنے مر چکے ہیں انہیں زندہ کیا جائے گا اور جتنے زندہ ہیں انہیں زندہ رہنے دیا جائے گا۔ اور پوری انسانیت کو اکٹھا کیا جائے گا۔ مسیح فرشتوں کے ساتھ بادلوں پر تشریف لائیں گے۔ اس وقت وہ جلالی جسم میں ہوں گے۔ اور تمام انسانوں کی عدالت کریں گے۔ جنہوں نے مسیح کے تجسم صلیبی اور دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان لایا ہو گا ان کو ہمیشہ کی زندگی یعنی جنت مل جائے گی۔ اور جو برائی میں رہ کر اپنی طبعی گناہ گار فطرت میں رہ کر مرے ہوں گے۔ یا اسی فطرت پر زندہ ہوں گے

السلام اپنے پیرو کو قیامت کی ہولناکی سے خبردار کرتے ہیں۔

"دنیا کے آخر میں ایسا ہی ہو گا فرشتے نکلیں گے اور راستبازوں کے درمیان سے بدکاروں کو جدا کریں گے اور انہیں آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے وہاں رونا اور دانتوں کا بجنا ہو گا"

(یوحنا ۱۳۔ ۴۹ تا ۵۰)

یوم آخرت کو مسیح علیہ السلام عدالت کے دن سے موسوم فرماتے ہیں آپ فرازین' بیت صیدا اور کفرنحوم کے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ تمہارا انکار تمہاری تباہی پر منتج ہو گا سچائی جس انداز سے تمہیں دی گئی ہے اگر صور اور صیدا کو دی جاتی تو ہرگز انکار نہ کرتے ان تباہ شدہ شہروں سے عبرت حاصل کرو اور انکار نہ کرو آپ فرماتے ہیں۔

"اے زریں تجھ پر افسوس اے بیت صیدا تجھ پر افسوس ....
پس صور اور صیدوں کا حال عدالت کے دن تمہارے حال سے زیادہ قابل برداشت ہو گا..... لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ عدالت کے دن سدوم کے ملک کا حال تیرے حال سے زیادہ قابل برداشت ہو گا۔"

(متی ۱۱: ۲۰ تا ۲۴)

۵۔ قیامت کے وقوع کو آپ نے زوان (ایک فصل) کی کٹائی سے تشبیہ دی۔ زوان جب تیار ہو جاتا ہے تو اسے فصل سے الگ کاٹ کر آگ میں جلا دیا جاتا ہے۔ اور فصل کو الگ کاٹ کر غلہ حاصل کیا جاتا ہے۔ قیامت کے روز ایسے ہی نیک و بد کو الگ الگ کر کے صلہ دیا جائے گا۔ آپ فرماتے ہیں۔ "اچھے بیج کا بونے والا ابن انسان ہے اور کھیت دنیا ہے۔ اور اچھا بیج بادشاہی کے فرزند ہیں اور زوان بدی کے فرزند۔ اور وہ دشمن جس نے اسے بویا وہ شیطان ہے۔ اور کٹائی کا وقت دنیا کا آخر ہے۔

ان کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

اہل اسلام کے نزدیک ہر ذی روح مر جائے گا۔ اور دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ خود تخت عدالت پر جلوہ افروز ہوں گے۔ اور فیصلہ ایمان اور عمل صالح کی بناء پر ہو گا۔ مسیح علیہ السلام ایک انسان کی حیثیت سے وقوع قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے۔

احادیث مبارکہ میں اسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

ان کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

اہل اسلام کے نزدیک ہر ذی روح مرجائے گا۔ اور دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالٰی خود تخت عدالت پر جلوہ افروز ہوں گے۔ اور فیصلہ ایمان اور عمل صالح کی بناء پر ہوگا۔ مسیح علیہ السلام ایک انسان کی حیثیت سے وقوع قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے۔

احادیث مبارکہ میں اسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی

قرآن کریم میں تو نہایت ہی اجمال کے ساتھ مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کو بیان کیا گیا ہے۔ سورہ زخرف میں ہے

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا

(سورۃ زخرف)

"اور بے شک وہ نشانی ہے قیامت کی۔ پس تم اس میں ذرا بھی شک مت کرو"۔ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی تفسیر مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی سے کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر حضرت ابو ہریرہ، ابن عباس، ابو العالیہ، ابو مالک، عکرمہ، حسن بصری، قتادہ، ضحاک وغیرہ سے مروی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک گفتگو میں اس کو نہایت ہی تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

"شب معراج میری ملاقات حضرت ابراهیم حضرت موسیٰ، اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے ہوئی۔ آپس میں قیامت کا ذکر ہونے لگا کہ کب آئے گی۔ حضرت ابراهیم علیہ السلام سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا مجھے علم نہیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا

اظہار فرمایا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باری آئی تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار فرمایا کہ قیامت کے وقوع کا ٹھیک وقت تو اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ میرے رب کا مجھ سے وعدہ ہے کہ قیامت سے پہلے جب دجال نکلے گا تو میں اس کے قتل کرنے کے لئے نازل ہوں گا۔ اور وہ مجھے دیکھ کر اس طرح پگھلنے لگے گا۔ جیسے سیسہ پگھلتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس کو میرے ہاتھ سے ہلاک کر دیں گے۔ یہاں تک کہ شجر و حجر بھی پکار اٹھیں گے۔ کہ اے مسلم میرے پیچھے کافر چھپا ہوا ہے اسے قتل کر دے۔ قتل دجال کے بعد لوگ اپنے اپنے علاقے اور ملک کو لوٹ جائیں گے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یاجوج ماجوج نکلیں گے، وہ جس چیز پر سے گزریں گے اسے تباہ کر دیں گے۔ تب لوگ میرے پاس ان کی شکایت کریں گے۔ پس میں اللہ تعالیٰ سے ان کے حق میں بددعا کروں گا تو اللہ تعالیٰ ان پر یک بارگی موت طاری کر دیں گے یہاں تک کہ زمین ان کی بدبو سے متعفن ہو جائے گی۔ سو میرے رب کا مجھ سے یہ عہد ہے کہ جب ایسے ہو گا تو قیامت کی مثال پورے دنوں کی حاملہ کی سی ہو گی جس کے بارے میں اس کے مالک نہیں جانتے کہ اچانک دن کو یا رات کو کسی وقت وضع حمل ہو جائے"

(مسند احمد، ابن ماجہ، مستدرک حاکم، اب جریر)

ایک حدیث پاک میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام، سرور کائنات ﷺ کے خلیفہ کی حیثیت سے آئیں گے۔ "سن رکھو کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے اور میرے درمیان کوئی نبی اور رسول نہیں ہوا۔ سن رکھو کہ وہ میرے بعد میری امت میں میرے خلیفہ ہیں۔ سن رکھو کہ وہ دجال کو قتل کریں گے۔ صلیب کو توڑ دیں گے۔ جزیہ بند کر دیں گے لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے گی۔ سن رکھو جو شخص تم سے ان کو پائے ان

سے میرا سلام کہے"

(مجمع الزاوئد ص ۲۰۵ ج ۸)

(در منثور ص ۲۴۲ ج ۲)

حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی قرآن کریم اور احادیث مبارکہ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور اس پر پوری امت کا اجماع ہے۔

سے میرا سلام کہے"

(مجمع الزاوئد ص ۲۰۵ ج ۸)

(در منشور ص ۲۴۲ ج ۲)

حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی قرآن کریم اور احادیث مبارکہ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور اس پر پوری امت کا اجماع ہے۔

الرد الجميل لالٰهية عيسى بصريح الانجيل

مسیح خدا نہیں

امام محمد غزالی

الردّ الجميل لإلهية عيسى بصريح الإنجيل

(مسیح خدا نہیں)

امام محمد غزالی

مسیح خدا نہیں

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن و رحیم ہے اور اسی پر مجھے بھروسہ ہے۔"

اس کے بعد میں اللہ کی حمد کرتا ہوں۔ اور محمد کریم کی ذات پر درود بھیجتا ہوں۔ جو تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔ اور یہ ہدیہ درود آپ ﷺ کی آل اور آپ ﷺ کے تمام صحابہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میں نے مسیحی عقائد کے متعلق چند مباحث دیکھے ہیں۔ جن کی بنیادیں نہایت کمزور، اور قوت و طاقت سے خالی، ہیں اور ان کو اختیار کرنا محض عیب ہے۔ اگر کوئی شخص ان عقائد میں غور کرے تو اسے پتہ چل جائے۔ کہ ان کی عقلیں کتنا عجیب سوچتی ہیں۔ اور نہ وہ ان عقائد کی مشکل گتھیوں کو عقلمندی کے باوجود نہیں سلجھا سکے۔

عیسائیوں نے ان عقائد کو صرف تقلید کی بناء پر اپنا رکھا ہے۔ انہوں نے ان ظواہر کو مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے۔ جن کو قدیم عیسائیوں نے اپنا رکھا تھا اور آنے والی نسلوں نے اپنی کم علمی کی وجہ سے ان مشکلات کی وضاحت نہیں کی۔ اب یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ وہی شریعت ہے۔ جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مشروع کیا تھا۔ جو کچھ نصوص میں آیا ہے۔ یہ لوگ ان پر اندھا اعتقاد رکھنے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں۔ کہ یہ چیزیں انسانی فکر سے ماوراء ہیں۔ ان میں تاویل نہیں ہو سکتی۔ اور ان کے ظاہر کو کوئی اور معنیٰ نہیں پہنایا جا سکتا۔

مسئلہ اتحاد

اس رائے میں ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ جس کی اکثریت ہے۔ اس گروہ کے افراد ان علوم سے بالکل ناآشنا ہیں۔ جن کے ذریعے کوئی شخص محال چیز کے استحالہ کو دیکھ کر یہ یقین کر لیتا ہے۔ کہ اس کا پایا جانا محال ہے۔ اور کسی چیز کی جانب وجوب کو دیکھ کر اس کے عدم وقوع کی نفی کرتا ہے۔ اور ممکن کے امکان کو ملاحظہ کر کے وہ یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ اس کے عدم اور وجود کی دونوں جہتیں محال لازم ہیں۔ ان لوگوں کے ذہن میں بچپن سے یہ عقیدہ مرتسم ہو چکا ہے۔ اور وہ اس میں اس قدر غفلت برت گئے ہیں۔ کہ اب اس نے ایک ملکہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس گروہ کا بیماری سے شفاء یاب ہونا مشکل ہے۔

دوسرا گروہ جو قدرے فہم و فراست رکھتا ہے۔ اور اسے کچھ علوم سے واقفیت بھی ہے۔ آپ اس دوسرے گروہ کو اس عقیدہ میں ناقص پائیں گے۔ اس گروہ کے افکار پہلے گروہ کے افکار سے مطابقت نہیں

رکھتے۔ یہ لوگ مسئلہ اتحاد میں تو فلاسفہ کی تقلید کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اس چیز کو قبول کرنا بہت بڑی بات سمجھتے ہیں۔ جو عقل سلیم سے ثابت شدہ قواعد کو توڑ دے۔ وہ اس مشکل کا حل تقلید محض میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ فلاسفر نے علوم مخفیہ میں کوشش کی اور ان علوم کو واضح اور عیاں کر دیا۔ سو جس کی یہ شان ہو۔ وہ اس لائق ہے کہ اس کے اقوال کو تسلیم کیا جائے۔ اور اعتقادات میں اس کی تقلید کی جائے۔ مسئلہ اتحاد میں وہ پہلے گروہ سے مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس اتحاد کی نوعیت جسم و روح کے تعلق کی مانند ہے۔

مگر یہ بے چارے تھوڑا سا بھی عقل سے کام لیں۔ اور تعصب اور خواہش نفسانی کو بھی ترک کر دیں۔ تو یقیناً وہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ صحیح طریقہ چھوڑ چکے ہیں۔ اور حق کے راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔ ان کی اس گمراہی کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے دو یہ ہیں۔

ا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اسے (اتحاد) قیاس کی کوئی قسم قرار دینا غلط ہے۔ کیونکہ قیاس علت کی بناء پر حکم کو اصل سے فرع کی طرف لوٹاتا ہے۔ اور یہاں کون سی ایسی علت ہے۔ جس کو قائل نے اس تعلق کا مقتضی سمجھا جس کی بات فلسفی کرتے ہیں۔ اور پھر اسے ذات باری کی طرف لوٹا دیا تاکہ قیاس صحیح ہو سکے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسے (اتحاد) تشبیہ و تمثیل قرار دینا بھی غلط ہے۔ کیونکہ مشبہ بہ کا معلوم و متصور ہونا ضروری ہے۔ تاکہ مشبہ بہ کے علم سے مشابہت کا علم ہو سکے۔ اور قائل اگر پوری کوشش صرف کر دے تو پھر بھی حقیقت امر اور حقیقت تعلق کے درمیان کوئی ادنیٰ مشابہت پانے سے بھی اپنے عجز کا اقرار کرے گا۔ اگر صورت حال یہ ہو کہ حقائق ہی نا

معلوم ہوں۔ تو قیاس کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

اس قیاس کا استعمال تو فروعات میں بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قیاس کی اقسام مجورہ میں سے ہے۔ جسے قیاس تعقیدی کہتے ہیں۔ قیاس تعقیدی یہ ہے۔ کہ حکم خفی کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ یقنا" قیاس کرنے والا ایسے دلائل سے اسے ثابت کرے گا۔ جو اس حکم سے بھی زیادہ پردہ خفا میں ہوں گے۔ ثبوت کے لئے نظر و فکر کے محتاج ہوں گے۔ اور ایسے حکم کا استخراج ان پیچیدہ دلائل سے ہو گا۔ جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہو گا۔ اور وہ ماخذ میں لاینحل عقدے ہوں گے۔

قیاس کی یہ قسم جب فروعات میں بھی کام نہیں آسکتی۔ جن کی بنیاد معمولی سے ظن پر ہوتی ہے۔ تو بھلا ان اصولوں میں کیسے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ جن کا تعلق ذات واجب الوجود سے ہے۔ اور اس قیاس کے ذریعے مخالفین کا دعویٰ کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔ بفرض محال حکم کی بنیاد معلوم بھی ہو جائے۔ تو پھر بھی ذات باری تعالیٰ کا کسی انسان سے ایسا تعلق ثابت نہیں ہو سکتا۔ جیسا تعلق روح اور جسم میں ہے۔ کیونکہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ روح اور جسم میں ایک تعلق ہے۔ اور اس تعلق کی شرط یہ ہے کہ روح اور جسم کے درمیان مناسبت اور موافقت ہے۔ اور اسی مناسبت کی وجہ سے یہ تعلق قائم ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ تو ایسی موافقت سے پاک ہے۔

اگر ان کی بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ فلاسفہ کی آراء کے مطابق جو تعلق وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ متصور ہے۔ تو تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اور نہ ہی عیسیٰ علیہ السلام کے لئے اثبات الوہیت کا مقصد پورا ہو گا۔ کیونکہ فلاسفہ کہتے ہیں۔ کہ روح اور جسم میں تعلق تدبیری ہے۔ اور اسی

تعلق کی بناء پر روح اور جسم دونوں رنج اور راحت محسوس کرتے ہیں۔ اور اللہ اور بندے کے درمیان ایسا تعلق مراد لینا محال ہے۔ کیونکہ جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے رنج و غم میں مبتلا ہونا محال ہے۔

رہا یہ کہ یہ نسبت تدبیریہ حصول لذت سے مجرد تسلیم کی جائے تو پھر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ خالق افراد عالم میں سے ہر ہر فرد کا مدبر ہے۔ لہٰذا اسے ہر فرد سے نسبت تدبیریہ ہے۔

سوال

اگر یہ کہا جائے کہ اس سے مراد وہ نسبت ہے جو معجزات میں اپنا اثر ظاہر کی ہے۔ مثلاً مردے زندہ کرنا تو اس سے ہمارا مقصود ثابت ہوتا ہے۔

جواب

تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اتیان معجزہ کی نسبت تو عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ دوسرے اشخاص کے لئے بھی ثابت ہے۔ مثلاً عیسائی بھی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو چھڑی میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور میت کو زندہ کرنا بے جان کو زندگی سے متصف کرنا ہی تو ہے۔ بلکہ چھڑی کو سانپ بنانا مردہ کو زندہ کرنے سے زیادہ معجز نما ہے۔ کیونکہ کسی ایسی چیز کو زندہ کر دینا جو کبھی زندگی سے متصف نہیں رہی بنسبت ایک چیز کو سابقہ حالت پر لانے سے زیادہ معجز نما ہے۔ اسی طرح سمندر کا پٹ کر ہر لہر کا ستون کی مانند ٹھہر جانا عظیم معجزہ ہے۔ (جس کا صدور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ہوا) تورات جس کی عیسائی تصدیق کرتے ہیں آج بھی اس بات کی گواہی دے رہی ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی آستین سے

ید بیضا نکالا اور پھر اسے اصلی رنگت پر لوٹا دیا۔ عیسائیوں کی ان تمام کتابوں میں جو کلیساؤں میں پڑھی جاتی ہیں یہ بات درج ہے کہ عیسیٰ کے دو شاگردوں ایلیا اور الیشع نے مردے زندہ کئے۔ ایلیا نے ارملا کے بیٹے کو زندہ کیا۔ اور یوشع علیہ السلام کے لئے سورج ٹھہر گیا۔ یہاں تک کہ وہ شہر میں واپس اسی طرح آگئے۔ یہ وہ تمام معجزات ہیں جن کا عیسائی انکار نہیں کرتے۔

ایسے انبیاء بھی تشریف لائے ہیں۔ جن پر کسی کتاب کا نزول نہیں ہوا۔۔ اور ان کے لئے اتیان معجزہ کی نسبت کے لئے کوئی مانع نہیں تھا مگر عدم رسالت کی بناء پر انہیں ان براہین کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جن کی رسالت کو احتیاج ہے۔

ایک نکتہ:۔

اس بات (ید بیضا موسوی) پر قرآن کریم کے الفاظ سے اگاہی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ۔

اور تورات کے الفاظ یوں ہیں۔

وهنايا ذو مصراعت كالشولغ

عبرانی زبان کے ان الفاظ کا ترجمہ یوں ہے۔

یہ ان کا سفید ہاتھ ہے جس کی رنگ برف کی مانند ہے۔

ید بیضا معجزہ تھا

تورات نے برص کی تصریح کی ہے۔ جب کہ کتاب مبین کے الفاظ اس بات کی تصریح کرتے ہیں۔ کہ ید موسوی کی سفیدی کسی بیماری کا نتیجہ

نہیں تھی۔

بادی النظر میں یہ چیز عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر عقلمند اور تعلیم یافتہ شخص کے لئے اس بات کو سمجھنا کوئی محال نہیں کہ ہاتھ کی سفیدی بغیر بیماری کے بھی ممکن ہے۔ برص ایک بیماری ہے۔ جو مزاج میں خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بیماری سے بلغم جم جاتا ہے۔ اور قوت متغیرہ کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور یہ بات بالکل عیاں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی سفیدی بیماری کی وجہ سے نہیں تھی کیونکہ جیسے ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ برص سوء مزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ جس سے قوت متغیرہ ماند پڑ جاتی ہے۔ اور جب قوت متغیرہ میں طاقت آجائے۔ رنگت میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ ید موسوی کی سفیدی اسی قوت کی تبدیلی کی وجہ سے ہو تو پھر اسے معجزہ نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی سفیدی معجزہ تھی جو خارق للعادۃ تھی قرآن کے یہ الفاظ من غیر سوء اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت مرحمت فرمائی تھی کہ وہ اپنے ہاتھ کو بغیر کسی بیماری کے سفید بنا دیں۔ اور قوت متغیرہ کے بغیر ہی اسے دوبارہ اپنی اصلی حالت پر لوٹا دیں۔ تاکہ ان کے ہاتھ پر معجزہ کا ظہور ہو جائے۔

معجزہ کی تعریف

معجزہ کا معہود کے خلاف ہونا ضروری ہے۔ یعنی سبب اور مسبب کے تعلق کے بغیر کسی چیز کا وقوع پذیر ہونا معجزہ کہلاتا ہے۔ سبب اور مسبب کے باہمی تعلق سے حسب عادت اگر کوئی چیز وقوع پذیر ہو تو یہ معجزہ نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی سفیدی کو بیان کیا۔ اور ساتھ یہ بھی

واضح کردیا۔ کہ یہ سفیدی بیماری کا نتیجہ نہیں ہے۔

فلاسفہ کی اندھی تقلید مسیحیوں کی گمراہی کا سبب ہے:

اس مسئلہ میں جو چیز ان کے اعتقادات کو کمزور کرتی ہے وہ فلاسفہ کے جسم و روح کے تعلق کا قاعدہ ہے۔ کیونکہ عیسائی فلاسفہ کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں۔ ان کا گمان ہے کہ یہ اعتقاد رکھنے والوں نے ایسے علوم مخفیہ ایجاد کئے ہیں جن کے ادراک سے عقلیں قاصر ہیں۔ جن کے ماخذ نامعلوم اور جن کی اساس کی جستجو محال ہے۔ لہٰذا جس شخص کو یہ کمال نصیب ہو اس کے اقوال خطا سے پاک ہوتے ہیں۔

جو شخص فلاسفہ پر اس قدر اندھا اعتقاد رکھتا ہے۔ تو اس کے لئے لازم ہے۔ کہ وہ فلاسفہ کے ان اعتقادات کو بھی تسلیم کرے۔

"نبوت کسبی ہے عالم قدیم ہے جو کون و فساد کو قبول نہیں کرتا باری تعالیٰ جزئیات کو نہیں جانتا۔ ایک سے صرف ایک ہی کا صدور ممکن ہے۔ مخلوق کا الہ وجود مجرد ہے۔ جسے اپنا بھی علم نہیں نہ وہ زندہ ہے۔ اور نہ ہی اسے کوئی قدرت حاصل ہے۔"

ایسے ہی دوسرے عقائد جو اہل شرع کے تمام تار و پود بکھیر کر انبیاء مرسلین کو دنیا کے جھوٹے ترین اشخاص (نعوذ باللہ) قرار دیتے ہیں۔ ایسے گروہ کی تقلید جو عیسائیوں کے بنیادی تصورات کو غلط قرار دیتا ہے۔ جو وہ خصوصیت سے عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ثابت کرتے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے فلاسفہ کہتے ہیں کہ مرد کا جوہر تولید ملے بغیر صرف عورت کے مادہ تولید سے بچے کی پیدائش محال ہے۔ جس سے عیسائیوں کے عقیدے کا ترک لازم آتا ہے۔ یا پھر جالینوس کی رائے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ

السلام اللہ تعالیٰ کا جزو قرار پاتے ہیں۔

سوال:

اگر کوئی یہ کہے کہ ٹھیک ہے۔ فلاسفہ کے جن نظریات کے بطلان پر دلائل و براہین قائم ہو جائیں۔ انہیں باطل سمجھا جائے۔ مگر دوسرے نظریات کے بارے میں حسن ظن نہ رکھنا۔ محض تعصب و ہٹ دھرمی ہے۔

جواب

تو اس کا جواب یہ ہوگا۔ کہ جس شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا نظریہ کبھی صحیح ہوتا ہے اور کبھی غلط جب تک ایسے شخص کے مستند اقوال سے واقفیت نہ ہو جائے اس کی تقلید کرتے ہوئے شارعین کے اقوال کو پس پشت ڈالنا اور انجیل کی ان ظاہری نصوص پر اعتماد نہ کرنا۔ جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت کی تصریح ملتی ہے۔ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں جن نصوص کے ظاہری الفاظ عیسائیوں کے عقائد کو ثابت کرتے ہیں۔ چونکہ وہ کم ہیں۔ اور عقل کے خلاف ہیں۔ لہٰذا ان نصوص کی تاویل کی جائے گی۔ اور صراحت والی نصوص سے ان کو تطبیق دے دی جائے گی۔ اور ان کو ظاہری معنوں پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

السلام اللہ تعالیٰ کا جزو قرار پاتے ہیں۔

سوال:

اگر کوئی یہ کہے کہ ٹھیک ہے۔ فلاسفہ کے جن نظریات کے بطلان پر دلائل و براہین قائم ہو جائیں۔ انہیں باطل سمجھا جائے۔ مگر دوسرے نظریات کے بارے میں حسن ظن نہ رکھنا۔ محض تعصب و ہٹ دھرمی ہے۔

جواب

تو اس کا جواب یہ ہو گا۔ کہ جس شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا نظریہ کبھی صحیح ہوتا ہے اور کبھی غلط جب تک ایسے شخص کے مستند اقوال سے واقفیت نہ ہو جائے اس کی تقلید کرتے ہوئے شارعین کے اقوال کو پس پشت ڈالنا اور انجیل کی ان ظاہری نصوص پر اعتماد نہ کرنا۔ جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت کی تصریح ملتی ہے۔ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں جن نصوص کے ظاہری الفاظ عیسائیوں کے عقائد کو ثابت کرتے ہیں۔ چونکہ وہ کم ہیں۔ اور عقل کے خلاف ہیں۔ لہٰذا ان نصوص کی تاویل کی جائے گی۔ اور صراحت والی نصوص سے ان کو تطبیق دے دی جائے گی۔ اور ان کو ظاہری معنوں پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

وہ نصوص جن سے الوہیت عیسیٰ

کا وہم ہوتا ہے

اب میں ان نصوص کو فرداً فرداً بیان کرتا ہوں۔ اور فصول کا حوالہ بھی دیئے چلتا ہوں کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ ان نصوص کا انکار نہ کر دیں۔ کیونکہ ان کی کتب ان کے دلوں میں محفوظ نہیں ہیں۔ نصوص کے ذکر کے سے قبل دو ایسے اصول بیان کرنا ضروری ہیں جن پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

پہلا اصول:۔

جب کوئی نص عقل کے موافق ہو تو اس کا ظاہری معنی مراد ہوتا ہے۔ اور اگر خلاف عقل ہو تو تاویل واجب ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جب

کسی نص کے متعلق یہ اعتقاد ہو کہ اس کے حقیقی معنی مراد بہ نہیں۔ تو پھر مجازی معنی لینا واجب ہو جاتا ہے۔

دوسرا اصول:۔

جب دلائل متعارض ہوں بعض ثبوت حکم پر دلالت کریں۔ اور بعض نفئ حکم پر تو ان دلائل کے تعارض کا خاتمہ ضروری ہوتا ہے۔ جب تک یہ واضح نہیں ہوجاتا کہ نہ تو یہ ایک معنی پر جمع ہو سکتیں ہیں۔ اور نہ ہی اس معنی سے ہٹ کر ان کا کوئی اور معنی مراد لیا جا سکتا ہے۔

جب یہ بات مقرر ہو گئی۔ تو اب میں ان نصوص کو ذکر کرتا ہوں۔ جن سے الوہیت عیسیٰ کا وہم ہوتا ہے۔ مگر وہ مجاز پر محمول ہیں۔ نیز ان نصوص کو بھی ذکر کروں گا۔ جو مسئلہ اتحاد پر دال ہیں۔ مگر وہ بھی مجاز پر محمول ہیں۔ جیسا کہ آپ کا قول ہے۔

"میں اور باپ ایک ہیں۔ جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا۔ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے۔"

بعد ازیں ان نصوص کو ذکر کروں گا۔ جو عیسیٰ علیہ السلام کے انسان محض ہونے پر دال ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان نصوص کو بھی ذکر کیا جائے گا۔ جن سے عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ عیسائی ان نصوص کی تاویل کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور وضاحت اور مشکلات کو سمجھنے سے قاصر رہنے کی وجہ سے ان نصوص سے عمومی معنی مراد لیتے ہیں۔ اس سے حق جو بالکل عیاں اور ظاہر ہے نہیں سمجھ سکتے۔

پہلی نص:۔

اس نص کو یوحنا نے اپنی انجیل کی چوبیسویں فصل میں ذکر کیا ہے۔

میں اور باپ ایک ہیں (مسیحی ان الفاظ سے باپ اور بیٹے میں جوہر کے ایک ہونے کا استدلال کرتے ہیں امام صاحب نے اس نظریے کا رد کیا ہے: مترجم) یہودیوں نے اسے سنگسار کرنے کے لئے پھر پتھر اٹھائے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں ان میں سے کس کام کے سبب سنگسار کرتے ہو؟ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں۔ بلکہ کفر کے سبب سے سنگسار کرتے ہیں۔ اور اس لئے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا کہ میں نے کہا کہ تم خدا ہو؟ (یہ الفاظ زبور کے ہیں قاضیوں کو خدا کہا جا رہا ہے: مترجم) جب اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا۔ اور کتاب مقدس کا باطل ہونا ممکن نہیں۔ آیا تم اس شخص کو جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے؟ اس لئے کہ میں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں۔"

ہماری رائے میں یہ نص مسئلہ اتحاد میں ہمارے مقصد کو کافی حد تک پورا کرتی ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ جب یہودیوں نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ (میں اور باپ ایک ہیں) تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ وضاحت کی کہ اس سے مراد ظاہری الفاظ نہیں ہیں بلکہ اس سے مجازی معنی مراد بہ ہیں۔ اور تشبیہ دے کر اس مجاز کے جواز کی مثال بھی قائم کر دی اور کہا "تمہاری شریعت میں تم پر خدا کا اطلاق کیا گیا ہے۔ حالانکہ تم خدا نہیں ہو۔ تمہیں خدا اس لئے کہا گیا ہے کہ تمہاری طرف خدا کا کلام آیا ہے"۔ اور اس وصف میں تمہارے ساتھ میں بھی شریک

ہوں۔"

شریعت اسلامیہ میں بھی یہ چیز ملتی ہے حدیث قدسی ہے۔

وَلَنْ یَتَقَرَّبَ اِلَیَّ الْمُتَقَرِّبُوْنَ بِاَفْضَلَ مِنْ اَدَآءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِمْ ثُمَّ لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ بَصَرَاہُ الَّذِیْ یَبْصُرُبِہٖ وَلِسَانَہُ الَّذِیْ یَنْطِقُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّذِیْ یَبْطِشُ بِھَا۔

"فرائض سے افضل ہرگز کوئی ایسی عبادت نہیں جو میرے بندوں کو میرے قریب کر دے۔ پھر نوافل کے ذریعے میرے بندے میرا قرب حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ حتی کہ میں ان سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں ان سے محبت کرتا ہوں تو میں ان کی سماعت بن جاتا ہوں۔ جس سے وہ سنتے ہیں ان کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتے ہیں۔ اور ان کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ کلام کرتے ہیں۔ اور ان کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ چھوتے ہیں۔"

خالق کا ان جوارح میں حلول کرنا یا ان جوارح سے عبارت ہونا محال ہے۔ مگر بندے نے اپنی طاقت اطاعت الٰہی میں صرف کر دی تو اللہ کی طرف سے اسے ایسی طاقت اور قدرت بخش دی گئی۔ کہ زبان اور ہاتھ وغیرہ سے وہ ایسے اعمال حسنہ سرانجام دیتا ہے۔ جو قرب کا سبب بنتے ہیں۔ اسی لئے جب کوئی شخص کسی دوسرے کو تلوار چلانے میں مدد دیتا ہے۔ اور اگر یہ شخص مدد نہ کرتا تو دوسرا شخص تلوار چلانے کی قدرت حاصل نہ کر سکتا۔ ایسے شخص کے لئے کہا جا سکتا ہے۔ کہ " میں تمہارا ہاتھ ہوں جس سے تو نے تلوار چلائی ہے۔ یہ مجاز کی ایک صورت ہے۔ جس کا استعمال مستحسن اور عام ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مجازا" اس نص میں وضاحت کر دی ہے کہ ان کو خدا کہنے کی وجہ ان کی طرف خدا کے کلام کا آنا ہے۔ اور کلام سے مراد لفظ جو حروف سے ترتیب پاتا ہے۔ ہر گز مراد نہیں کلام سے مراد سر الٰہی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے عنایت فرما دیتا ہے۔ جس پر یہ بخشش ہو۔ اسے قربت خداوندی کی توفیق مل جاتی ہے۔ اور وہ صرف اس چیز کو پسند کرتا ہے۔ جس چیز کو خداوند قدوس پسند کرتا ہے۔ صرف اس چیز کو ناپسند کرتا ہے جو خداوند عالم کو ناپسند ہو اور وہ صرف انہی اعمال و اقوال کا ارادہ کرتا ہے۔ جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل ہو۔ جیسا کہ اس کی قدرت کے شایاں ہے۔ ایسے میں ان کے لئے مجازا" ایسے الفاظ کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔

مذکورہ مجازی معنی مراد لینے کے یہ تاویل صحیح ہے اور اس پر یہ نص بھی دلالت کرتی ہے۔ جس کے ظاہری معنی مراد لینے سے عیسیٰ علیہ السلام نے احتراز کیا ہے (تم اس شخص کو جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا ہے کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے) پس آپ نے تصریح کر دی کہ وہ ایسے رسول ہیں۔ جو خدائی سے پاک ہیں۔ جس کا تصور یہودی کر رہے ہیں۔ انہوں نے تو یہ دعویٰ مجازا" اس لئے کیا ہے۔ کہ انبیاء کی غیر انبیاء پر فضیلت ثابت ہو جائے (تم اس شخص کو جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا ہے کہتے ہو کہ کفر بکتا ہے۔) نص کے اس حصہ سے مراد یہ ہے۔ کہ جس سبب کی بناء پر ان الفاظ کا استعمال میرے لئے صحیح ہے۔ اس سبب میں تو تم بھی میرے شریک ہو۔ میں تو نبوت اور رسالت کی وجہ سے تم سے افضل ہوں۔

آپ نے جو تمثیل بیان کی اگر یہ یہودیوں کے اس مغالطے کا قطعی جواب نہیں تھا۔ جو ظاہری الفاظ سے سمجھ رہے تھے۔ تو گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کو دھوکا دیا۔ اور ان کے اعتقادات کو جان بوجھ کر خراب کیا۔ یہ سمجھنا محض جہالت ہے۔ اور خداوند قدوس کی ناراضی کا موجب ہے۔ اور یہ ان انبیاء و رسل کے ہرگز شایان شان نہیں۔ جو ہدایت الی الحق کے لئے تشریف لاتے رہے ہیں۔ کیونکہ ضرورت کے وقت سے بیان حق کو موخر کرنا انبیاء کے لئے جائز نہیں اور یہ کیسے ممکن تھا کہ دنیا کے نجات دہندے عیسیٰ علیہ السلام دفع وقتی کی خاطر وہ بات کہتے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا آپ بے شک دنیا والوں کے لئے مخلص تھے اسی لئے تو عبادت کے لائق خدا کا انہیں تعارف کروا دیا۔ اگر آپ قابل عبادت خدا ہوتے تو آپ نے جو تمثیل بیان کی ہے غیر کی عبادت کا حکم اور اللہ کی عبادت سے پھیرنے کے مترادف ہوتا گویا آپ نے وضاحت کر دی کہ خدا تو صرف وہی ہے جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ اپنی خدائی کا دعوی ایسے شخص کو کیسے زیب دیتا ہے۔ جو دنیا کی نجات کے لئے تشریف لایا ہو۔ ایسی گمراہی تو کسی ایسے امتی کے لئے بھی مناسب نہیں۔ جو ہدایت و راہنمائی کے منصب پر فائز ہو چہ جائیکہ ایک رسول اس بات کا ارتکاب کرے۔

سوال:

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کے شر سے بچنے کے لئے اپنے خدا ہونے کا انکار کیا۔

جواب

تو جواب یہ ہوگا۔ خداوند عالم اور کائنات کو وجود عطا کرنے والے کا خوف زدہ ہونا قرین قیاس نہیں بڑے تعجب کی بات ہے مخالف ان حقائق کو روز روشن کی طرح عیاں دیکھ کر کیسی گفتگو کر رہا ہے۔ مخالف بغیر سوچ سمجھے اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہے۔ حالانکہ خود حضرت عیسیٰ نے اس نص کی تاویل فرمادی ہے۔

دوسری نص:

اس نص کو یوحنا ہی نے اپنی انجیل کی ستائیسوی فصل میں بیان کیا ہے۔

"اے قدوس باپ! اپنے اس نام کے وسیلہ سے جو تونے مجھے بخشا ہے ان کی حفاظت کرتا کہ وہ ہماری طرح ایک ہوں۔" (یوحنا ۱۷: ۱۲)

یہ نص پہلی نص کی مانند کلام کو حقیقت سے مجاز کی طرف لے جانے کی قوی دلیل ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کے لئے یہ دعا کی کہ وہ اپنے نام کے وسیلہ سے ان کی اسی طرح حفاظت کرے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کی ہے۔ تاکہ اس حفاظت کے ذریعے وہ اللہ کے ساتھ ایک ہو جائیں پھر حرف تشبیہ ذکر کیا اور کہا جیسا کہ ہم ایک ہیں یعنی یہ ایک ہونا ایسا ہو جیسا میں آپ کے ساتھ ایک ہوں۔

اگر عیسیٰ علیہ السلام کا اللہ کے ساتھ ایک ہونا خدائی کا موجب ہے تو لازم آتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے لئے الوہیت کی دعا کر رہے تھے۔ جب کہ کسی بھی عقلمند شخص کو یہ چیز مناسب معلوم نہیں ہوگی بلکہ ایک عام آدمی بھی اسے محال تصور کرے گا۔

نص کا مفہوم:

یہ نص بھی پہلی نص کی طرح مجاز پر محمول ہے حضرت عیسیٰ نے اپنے رب سے دعا کی کہ وہ ان کے شاگردوں پر اپنی رحمتوں اور عنایتوں کی بارش کرے اور ان کو توفیق عطا کرے کہ وہ صرف اسی چیز کا ارادہ کریں جو خداوند قدوس کے ارادہ کے تحت آتی ہوں۔ صرف اسی سے ناراض ہوں جس سے وہ ذات ناراض ہو۔ اور صرف اسی چیز کو ناپسند کریں جو رب قدوس کو ناپسند ہو اور صرف انہی اعمال و اقوال کو بجالائیں جن کے کرنے سے اللہ راضی ہو اگر یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر مجازا" ایک ہونے کا دعویٰ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ مثال بھی اس موقف کی تائید کرتی ہے جو کوئی شخص اغراض و مقاصد میں اپنے دوست کے کلی موافقت رکھتا ہے۔ اپنے دوست کی پسند و ناپسند اس کی پسند و ناپسند قرار پاتی ہو تو یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اور میرا دوست ایک ہیں۔

اس نص میں آپ نے وضاحت کر دی کہ اللہ کے ساتھ میرا ایک ہونا مجازا" ہے اور میں حقیقت میں خدا نہیں ہوں (تاکہ وہ ہماری طرح ایک ہو جائیں) ان الفاظ سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ انہیں وہ توفیق عطا ہو جو ان میں یہ کیفیت پیدا کر دے کہ وہ اپنی منشا اور ارادے کو تیری منشا اور ارادے کے مطابق ڈھال لیں جیسا کہ میں اور آپ ایک ہیں کہ میں صرف اس چیز کا اردہ کرتا ہوں جس کا تو ارادہ کرتا ہے اور صرف اسے پسند کرتا ہوں جسے تو پسند کرتا ہے۔ (اے قدوس باپ! اپنے نام کے وسیلہ سے ان کی حفاظت کر) اس سے بھی یہی مراد ہے کہ نفع اور نقصان کا مالک صرف خداوند قدوس ہے۔ جس سے آپ نے دعا کی اگر عیسیٰ علیہ السلام خدا ہوتے تو اپنے شاگردوں کی خود حفاظت فرماتے اور کسی دوسرے سے ہرگز

التجا نہ کرتے۔

پولس، کورنتھیوں کو ارسال کردہ ایک خط میں ہمارے اسی مفہوم کی تصریح کرتا ہے کہتا ہے "اور جو خداوند کی صحبت میں رہتا ہے وہ اس کے ساتھ ایک روح ہوتا ہے۔" (ا کرنتھیوں ۶: ۱۷)

پولس کی یہ تصریح اس بات پر شاہد ہے کہ اُس نے مزکورہ نص سے وہی سمجھا جو ہم نے سمجھا اس کے نزدیک بھی مذکورہ نص ظاہر پر دال نہیں ہے۔

تیسری نص:۔

اس نص کو یوحنا ہی نے اپنی انجیل کی ستائیسویں فصل میں ذکر کیا ہے "انہیں سچائی کے وسیلہ سے مقدس کر تیرا کلام سچائی ہے جس طرح تو نے مجھے دنیا میں بھیجا اسی طرح میں نے بھی انہیں دنیا میں بھیجا اور ان کی خاطر میں اپنے آپ کو مقدس کرتا ہوں تاکہ وہ بھی سچائی کے وسیلہ سے مقدس کئے جائیں میں صرف انہی کے لئے درخواست نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے بھی جو ان کے کلام کے وسیلہ سے مجھ پر ایمان لائیں گے تاکہ وہ سب ایک ہوں یعنی جس طرح اے باپ! تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں وہ بھی ہم میں ہوں اور دنیا ایمان لائے کہ تو ہی نے مجھے بھیجا اور وہ جلال جو تو نے مجھے دیا ہے میں نے انہیں دیا ہے تاکہ وہ ایک ہوں جیسے ہم ایک ہیں۔" (یوحنا ۱۷: ۱۷ تا ۲۲)

یہ نص بالکل واضح ہے اور جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اسی کی تائید کرتی ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی الوہیت کے شبہ کو اپنے اسی قول کے مجازی معنی لیتے ہوئے ختم کر دیا۔

"وہ جلال جو تو نے مجھے دیا ہے میں نے انہیں دیا تاکہ وہ ایک ہوں" یعنی یہ جلال ان کے پراگندہ کاموں کو منظم کردے اور ان سے کلی طور پر تیری اطاعت کے مطابق کام وقوع پذیر ہوں اور وہ اسی چیز کو پسند کریں جسے تو پسند کرتا ہے صرف اسی چیز سے نفرت کریں جس سے تو نفرت کرتا ہے اور صرف اسی چیز کا ارادہ کریں جس کا تو ارادہ رکھتا ہے پس آراء' اعمال اور اعتقادت میں عدم تباین کے باعث وہ ایک ہو جائیں جیسا کہ ہم ایک ہیں یعنی جیسے میں آپ کے ساتھ ایک ہوں۔ کیونکہ جو جلال تو نے مجھے دیا ہے اس نے مجھ میں ایسی خصوصیت پیدا کر دی ہے کہ میں صرف اسی چیز کو چاہتا ہوں جسے تو چاہتا ہے۔ صرف اسی چیز کا ارادہ رکھتا ہوں جس کا تو ارادہ رکھتا ہے صرف اسی سے عناد رکھتا ہوں جس سے تو عناد رکھتا ہے۔ صرف اسی چیز کو ناپسند کرتا ہوں جس کو تو ناپسند کرتا ہے اور مجھ سے صرف وہی عمل اور قول صادر ہوتے ہیں جن سے تو راضی ہوتا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا ایک ہونا اس بات پر دال ہے کہ جس شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے اللہ کی اطاعت کی تو اس نے عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کی تو معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام نبی مرسل ہیں۔ کیونکہ یہی انبیاء و مرسلین کی شان ہے پھر آپ نے مجازی معنی کی یہ کہتے ہوئے پوری طرح وضاحت کردی (جس طرح اے باپ تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں وہ بھی ہم میں ہیں) آپ کی مراد یہ ہے کہ ان کے اقوال اور اعمال کلی طور پر تیری منشا کے مطابق ہو جائیں اور تیری مراد میری مراد ہے۔ ہم ایک ذات کی مانند ہیں کیونکہ ارادوں میں کوئی تباین

نہیں ہے۔

آپ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کیونکہ آپ کو خدشہ تھا کہ عوام الناس ان نصوص سے ظاہری معنی مراد لیں گے اسی لئے آپ نے وضاحت فرمادی اور کہا (اور دنیا ایمان لے آئی کہ تو نے ہی مجھے بھیجا) اسی بیان کو مزید واضح کرتے ہوئے کہ (میں صرف انہی کے لئے درخواست نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے بھی جو ان کے کلام کے وسیلہ سے مجھ پر ایمان لائیں گے تاکہ وہ سب ایک ہوں جیسے ہم ایک ہیں) آپ کی مراد یہ ہے کہ میں خدا نہیں ہوں میرا اللہ کے ساتھ ایک ہونا میری الوہیت کا مقتضی نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کے لئے خدا ہونے کی دعا کی۔

دیکھئے اس نص میں کس قدر حسن پایا جا رہا ہے کتنے صریح الفاظ ہیں جن کے حقیقی معنی لینے کی تصریح کی گئی ہے۔ اور کتنے ظاہری الفاظ ہیں جن کے ظاہری معنی مراد نہیں لئے گئے اور کتنے مجازات ہیں جن میں موجود قرائن حقیقی معنی مراد لینے سے مانع ہیں اس نص میں موجود ان محاسن سے عیسائی اعراض کر کے گزر جاتے ہیں کہنے والا کیا اچھا کہہ گیا ہے۔

وَكَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلاً صَحِيْحاً وَآفَتُهُ مِنْ فَهْمِ السَّقِيْمِ
وَلٰكِنْ تَأْخُذُ الْأٰذَانُ مِنْهُ عَلٰى قَدَرِ الْقَرَائِحِ وَالْعَلُوْمِ

کتنے ہی لوگ ہیں جو صحیح بات کو معیوب گردانتے ہیں اس کی اصل وجہ ان کی کم فہمی ہے۔

مگر کان تو بات سے علم اور ذوق کے مطابق ہی اثر لیتے ہیں۔

مقدس یوحنا کی تصریح

یوحنا کی انجیل کی پچاسویں فصل میں جو تصریح ملتی ہے وہ بھی مذکورہ تاویل پر دال ہے کہتے ہیں۔ "جو مجھ پر ایمان لاتا ہے وہ مجھ پر نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے پر ایمان لاتا ہے اور جو مجھے دیکھتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو دیکھتا ہے" (یوحنا کا پہلا خط ۴: ۱۳)

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت' اطاعت خداوندی ہے تو لازم آتا ہے عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں آپ نے کہا (جو مجھے دیکھتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو دیکھتا ہے) یعنی در حقیقت میں تو اس کی خبر دیتا ہوں میرا حکم اسی کا حکم ہے اور میرا روکنا اسی کا روکنا ہے۔ مجھ سے ان احکام کا صدور ہوتا ہے جو خداوند قدوس کی طرف سے جاری ہوتے ہیں۔ یہی سچے نبیوں کی شان ہے۔

سب سے واضح چیز جس سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے وہ ان نصوص سے ظاہری مراد نہیں بلکہ یہ مذکورہ مجازی معنی پر محمول ہے وہ یہ ہے کہ یوحنا بن زبدی جس نے انجیل کی املا کی ہے اور یہ نصوص اسی کی انجیل میں منقول ہیں وہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسی علیہ السلام کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ہے بلکہ وہ غلو کرتے ہوئے اسے حبیب رب کا نام دیتے ہیں اس نے بھی ان نصوص کے وہی معنی مراد لئے ہیں جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور اس نے ثابت کر دیا ہے کہ ان نصوص کے حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ مجازی معنی مراد ہیں۔

وہ اپنے ایک خط میں کہتا ہے "خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا اگر ہم ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں تو خدا ہم میں رہتا ہے۔ اور اس کی

محبت ہمارے دل میں کامل ہو گئی ہے چونکہ اس نے اپنی روح میں سے ہمیں دیا ہے اس سے ہم جانتے ہیں کہ ہم اس میں قائم رہتے ہیں۔ اور وہ ہم میں اور ہم نے دیکھ لیا اور گواہی دیتے ہیں کہ باپ نے بیٹے کو دنیا کا منجی کر کے بھیجا ہے۔" (یوحنا کا پہلا خط ۴: ۱۲ تا ۱۴)

یوحنا اسی خط میں ذکر کرتا ہے (جو کوئی اقرار کرتا ہے کہ یسوع خدا کا بیٹا ہے۔ خدا اس میں رہتا ہے اور وہ خدا میں) (ایضا ۱۵)

ان کے نزدیک اس جلیل القدر شاگرد نے اس نص میں یہ کہہ کر حلول کی تصریح کر دی (کہ اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اللہ میں رہتے ہیں اور وہ ہم میں رہتا ہے) نصوص مذکورہ میں اس جلیل القدر شاگرد نے عیسیٰ علیہ السلام پر اطلاق کئے جانے والے حلول کا مفہوم اگر یہ سمجھا کہ وہ خداوند ہونے کا مقتضی ہے تو اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی خدا ہونا ثابت کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ یوحنا بن زبدی کے بارے میں اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں الوہیت کا عقیدہ رکھتے تھے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یوحنا نے بھی ہمارے بیان کردہ مجازی معنیٰ ہی مراد لئے ہیں۔ آپ کا یہ اشارہ (کیونکہ اس نے اپنی روح سے ہمیں دیا ہے) بھی اس بات پر دال ہے کہ اس سے مراد اللہ کا لطف اور مہربانی ہے۔ جس سے ہم نے ان علوم کو جان لیا جو خداوند عالم ہمیں عطا کرنا چاہتا تھا پھر ہمیں ایسے عمل صالح کی توفیق بخش دی کہ ہم صرف وہی چاہتے ہیں جو وہ چاہتا ہے صرف وہی پسند کرتے ہیں جو وہ پسند کرتا ہے ایسی صورت میں مذکورہ مجازی معنیٰ کی طرف رجوع ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

چند اہم نکات

تیسری نص میں چند ایسے نکات باقی ہیں جن کو صرف گہرے غور وخوض سے سمجھا جا سکتا ہے وہ نکات یہ ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا (اور وہ جلال جو تو نے مجھے دیا ہے میں نے انہیں دیا ہے) اس نص کا ظاہر عموم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مخصوص جلال کی طرف اشارہ کیا ہے اور پھر اسے (جو تو نے مجھے دیا ہے) کے الفاظ سے متصف کر دیا ہے۔ اور ظاہر ہے اس مراد وہ تمام افراد ہیں جن کو جلال نصیب ہوا مثلاً "کوئی شخص کہتا ہے جو درہم آپ نے مجھے دیئے ہیں یا وہ تحفہ جو آپ نے بھیجا میں نے فلاں شخص کو دے دیا ہے۔ تو بظاہر یہ عبادت عموم پر دال ہو گی مگر انصاف کرنے سے پتہ چلے گا کہ اس سے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں۔ کیونکہ جلال سے مراد نبوت و رسالت ان پر مرتب ہونے والے درجات' صعود الی السماء اور ظہور معجزات ہرگز نہیں لیا جا سکتا بلکہ جلال کے لفظ کو کسی اور معنی پر محمول کیا جائے گا تاکہ لفظ مہمل نہ ٹھہرے۔

عطائے جلال سے مراد وہ علوم ہیں جو اللہ نے انہیں عطا فرمائے پھر عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے عمل صالح کی توفیق کا سوال کیا جو علم کا تقاضا ہے اور "فرمایا انہیں سچائی کے وسیلہ سے پاک کر"

یعنی میں نے انہیں وہ سب سکھا دیا ہے جو تیری شان کے لائق ہے یقیناً" یہی انبیاء و مرسلین کا وظیفہ ہے پس تو ہی انہیں ہدایت دے اور عمل صالح کی توفیق عطا فرما یہ علم کا تقاضا ہے پس یہ اس خدا کا درجہ ہے جو اعمال کی تخلیق پر قدرت رکھتا ہے۔

سوال

اگر یہ کہا جائے کہ جلال سے مراد وہ اتحاد ہے جو خدائی کا موجب بنتا ہے تو عیسائیوں کا عقیدہ ثابت ہو جائے گا۔

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ جلال سے مراد اتحاد نہ لینے پر دلائل قائم ہو چکے ہیں اگر چہ جلال کا لفظ عام ہے مگر آپ کو ایسا جلال عطا نہیں ہوا جو اتحاد کا مقتضی ہو۔

الوہیت وہبی نہیں ہو سکتی

افسوس! یہاں بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ کیا الوہیت بھی ایسی چیز ہے جو عطا کی جا سکتی ہو؟ یقیناً" اہل فکر اس کے ناممکن ہونے پر متفق ہیں۔ نصرانی عیسیٰ علیہ السلام کے لئے الوہیت کے ثبوت پر مصر ہیں حالانکہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود ہی اپنے الہ ہونے کی نفی کی ہے اور اس نص کے حقیقی معنی لینے سے احتراز کیا ہے۔

خدا پاک انسانی عوارض سے پاک ہے

یہ حقیقت ہے کہ اس نوعیت کا مشکل مسئلہ محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ یقینی دلائل نہ پیش کر دیئے جائیں خصوصاً" جب کہ عیسیٰ علیہ السلام میں زندگی کے تمام لوازمات حیوانیت (منطقی اصلاح) نطق، تھکاوٹ، بھوک، پیاس پائے جاتے ہیں۔ آپ رحم مادر میں رہے جب آپ کو سولی دینے کا فیصلہ ہوا تو آپ غمگین ہوئے۔ اور اللہ تعالی سے

دعا کی "اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔ ۸

یہ کلمات الوہیت کے منافی ہیں۔

(پس) عیسیٰ علیہ السلام کے انسان ہونے سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ انجیل مرقس میں ہے۔

"دوسرے دن جب وہ بیت عنیاہ سے نکلے تو اسے بھوک لگی اور دور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے مگر جب اس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا۔ (مرقس ۱۱: ۱۲، ۱۳)

اس نص میں مرقس نے تصریح کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھوک محسوس کی اور درخت کو پھلدار گمان کیا کہ انجیر کا موسم ہے یا یہ گمان کیا کہ یہ درخت بے موسم بھی پھل لاتا ہے مگر وہاں پہنچنے پر پتہ چلا کہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔

سوال

اگر کوئی یہ کہے کہ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے درخت کے لئے بے برگ و بار ہونے کی بد دعا کیوں کی؟

جواب:

تو جواب ہو گا کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے شاگردوں کو ثابت قدم رکھنا چاہتے تھے اور ان اعمال کی ترغیب دینا چاہتے تھے جن کا نتیجہ دعا میں اثر کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ کیونکہ انبیاء اور اولیاء کے ساتھ جنت کا وعدہ اس شرط پر کیا گیا ہے کہ وہ ناپسندیدہ اعمال سے محفوظ رہیں گے۔ اور فقر و فاقہ جیسی تمام تکالیف کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔ ممکن ہے سخت

تکالیف اور مشکلات کی کثرت عارفین کو مغلوب کر دے اور قصور تقویٰ کا سبب بنے اسی لئے عیسیٰ علیہ السلام نے اعمال صالح کا نتیجہ دکھا کر اپنے شاگردوں کو کثرت سے نیک اعمال کرنے کی ترغیب دی اور ان کے دلوں میں دنیاوی مصائب و آلام کو بے وقعت بنا دیا آپ نے درخت کے لئے بدعا اس لئے کی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ انبیاء کو تکالیف اور مشکلات کے جو کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے یہ ذلت و رسوائی نہیں بلکہ امتحاں اور آزمائش ہے جو راضی برضا ہو گا اور ہر حال میں شکر بجا لائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے معجزات دکھانے کی قدرت مرحمت فرمائے گا۔ اس نص کے بقیہ حصے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی اس تاویل کی صحت پر دلالت کرتا ہے آپ نے پطرس سے کہا۔

"اے ربی! دیکھ یہ انجیر کا درخت جس پر تو نے لعنت کی تھی سوکھ گیا ہے اگر تمہیں اللہ پر ایمان ہے میں تم سے سچ کہتا ہوں جو کوئی اس پہاڑ سے کہے کہ اکھڑ جا اور سمندر میں جا پڑ اور اپنے دل میں شک نہ کرے بلکہ یقین کرے کہ جو کہتا ہے وہ ہو جائے گا۔ تو اس کے لئے وہی ہو گا" (مرقس ۱۱: ۲۲، ۲۳)

یہ نص اس بات پر دلیل ہے کہ درخت کا خشک ہو جانا کرامت تھی کیونکہ آپ نے اپنے شاگردوں کو یہ بتا دیا تھا کہ ولایت کے ذریعے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ کر سمندر میں گر سکتا ہے۔ اور یہ کرامت درخت کے خشک ہونے سے زیادہ اعجاز نما ہے۔ ایسی ہی ایک اور نص انجیل میں ہمیں ملتی ہے۔ جو اس معنی کی وضاحت کرتی ہے عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان رکھتا ہے یہ کام جو میں کرتا ہوں وہ بھی کرے گا۔ بلکہ ان سے بھی بڑے کام کرے

گا"۔ (یوحنا ۱۴: ۱۳)

اس نص میں عیسیٰ علیہ السلام کی کی بھوک اور پھل طلب کرنے کی خواہش مذکورہ معنی کی تصریح کرتی ہے یہ خیال خود بخود باطل ہو جاتا ہے کہ آپ نے درخت کو خشک کرنے کی بدعا اس لئے دی کہ وہ اپنے شاگردوں کو یہ بتا سکیں کہ وہ مردوں کو زندہ کرسکتے ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام کا بھوک محسوس کرنا اور پھل طلب کرنا درخت تک آنے کی علت ہے جو معنی عیسائی مراد لیتے ہیں وہ لاعلمی اور غفلت پر مبنی ہے یقیناً- آپ پھل لینے کی خاطر ہی آئے تھے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ میں آیا اور میں نے درخت دیکھا تو پھل توڑنے کے لئے درخت کے پاس چلا گیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ درخت پر کوئی پھل نہیں ہے تو میں نے درخت کے خشک ہونے کی بدعا کی کہ مردوں کو زندہ کرنے پر میری قدرت کی دلیل قائم ہو جائے تو یقیناً- ہم کہیں گے کہ یہ ایک بے ہودہ شخص ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی سمجھ سے محفوظ رکھے۔

یہاں سے ان نصوص کا ذکر شروع ہو رہا ہے جو مسیح علیہ السلام کے انسان محض ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

چوتھی نص:۔

اس نص کو مرقس نے اپنی انجیل کی چوالیسویں فصل میں ذکر کیا ہے۔

"لیکن اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ اکیلا" ۔ (مرقس ۱۳: ۳۲)

اس نص میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انسان محض ہونے کی

تصریح کی گئی ہے اور آپ کے اس علم کی نفی کی گئی ہے جو رب قدوس کے ساتھ خاص ہے اور یہی آپ کے انسان ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

عیسائی ملائکہ اور ابن کا عطف ساعت کی ضمیر پر کرتے ہیں - یہ سوچ کس قدر غیر معقول ہے اگر اس چیز کو ملحوظ رکھا جائے تو تقدیر کلام یوں ہو گی۔ "لیکن اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی فرشتوں اور بیٹے کو کوئی جانتا ہے مگر باپ اکیلا"

کتنی عجیب بات ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کے لئے صفات الٰہیہ کے ثبوت کے لئے دلائل قطعیہ نہیں پاتے اور نہ ہی ظاہری الفاظ الوہیت عیسیٰ پر دلالت کرتے ہیں۔ تو اس قدر دور کی تاویلات کام میں لاتے ہیں کہ کان ان کو سننے کا یارا نہیں رکھتے یہاں بھی کس قدر ظاہر کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ اگر قائل سے پوچھا جائے کہ وہ کون سا لفظ ہے جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہو کہ ملائکہ اور ابن کے متعلق سوال کیا گیا تاکہ مذکورہ عبارت جواب بن سکے۔ تو وہ جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے فرض کر لیتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ لوگ ان سے ملائکہ اور ابن کے متعلق سوال کریں گے۔ سو انہوں نے سوال سی پہلے ہی جواب دے دیا۔ یہ تاویل محض اس لئے کی گئی ہے کہ علم خاص کی نفی سے بچ کر عیسیٰ علیہ السلام کے لئے الوہیت ثابت کی جا سکے۔

قائل نے جو تاویل ذکر کی ہے۔ اس میں علم خاص کی نفی تو بعینہ موجود ہے بلکہ یہ تاویل تو ان کی جہالت کی بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ اگر بیٹے اور ملائکہ کا عطف ساعت کی ضمیر پر کیا جائے تو معنی یہ ہو گا۔ کہ ساعت معینہ کا علم، بیٹے اور ملائکہ کی حقیقت کا علم اللہ واحد ہی جانتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب ابن کا اطلاق کرتے ہیں تو مراد اپنی

ذات ہوتی ہے اور جب باپ کا اطلاق کرتے ہیں تو خداوند عالم ہوتے ہیں۔ جس چیز سے بھاگ کر عیسائی یہ تاویل کر رہے ہیں۔ وہ تو اب بھی موجود ہے۔ بلکہ یہ پہلے کی نسبت زیادہ جہالت ہے کیونکہ مذکورہ نص میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ساعت خاص کے علم کی نفی کی گئی ہے۔ جبکہ تاویل کے بعد ساعت خاص کی معرفت کی نفی اپنی معرفت کی نفی اور حقیقت ملائکہ کے علم کی نفی تینوں لازم آئیں گی۔ بڑی عجیب سوچ ہے خدا ایسی سوچ سے محفوظ رکھے جو شماتت اعداد کا موجب بنے اس سوچ کو پڑھ کر آدمی ہنسی ضبط نہیں کر سکتا۔ کہ چھوٹی جہالت سے بچنے کے لئے ایک بڑی جہالت کا ارتکاب کر لیا گیا ہے۔

یہ بات بالکل عیاں ہو گئی ہے۔ کہ اس نص کے ظاہر کی مخالفت محض ڈھکوسلا ہے۔ ایک عقلمند کے لئے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ ان تاویلات میں اپنا وقت ضائع کرتا رہے۔

پانچویں نص:

اسے یوحنا نے اپنی انجیل کی ۱۷ فصل میں بیان کیا۔

"یسوع نے یہ باتیں کہیں اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر کہا اے باپ! وہ گھڑی آپہنچی اپنے بیٹے کا جلال ظاہر کر تاکہ بیٹا تیرا جلال ظاہر کرے چنانچہ تو نے اسے ہر بشر پر اختیار دیا ہے۔ تاکہ جنہیں تو نے اسے بخشا ہے ان سب کو وہ ہمیشہ کی زندگی دے۔ اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے۔ کہ وہ تجھ خدائے واحد اور خدائے برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں"۔ (یوحنا ۱۷: ۱'۴)

اس نص میں عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی تصریح کی گئی ہے۔

اسے ناسوت کی طرف لوٹانا ممکن نہیں کیونکہ عیسائیوں کے نزدیک مسیح لاہوت اور ناسوت دونوں کی مجموعی حقیقت کا نام ہے۔

اگر مدعی یہ دعوی کرے کہ یہ نص مجاز پر محمول ہے تو یہ دعوی درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ عرفاً" اس کا اطلاق امر ممتنع ہے مثلاً" کوئی شخص کہے کہ میں نے نیزہ بازی میں ماہر شخص کو دیکھا ہے۔ مگر اس میں نیزہ بازی کی مہارت نہیں تھی تو یقیناً" یہ لایعنی گفتگو ہوگی۔

یہ سب گفتگو اس وقت ہوگی جب قائل اس بات کا سہارا لے کر انجیل میں کل احکام بول کر بعض مراد لئے جاسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں عربی قواعد کی رو سے مذکورہ جواب کافی ہے۔ اور اگر قائل یہ سہارا نہ لے تو اعتراض ہی ساقط ہو جاتا ہے۔ پھر کسی اور جواب کی ضرورت نہیں رہتی۔

آپ نے اس کی تائید ان الفاظ سے کی "تاکہ جسے تونے اسے بخشا ہے ان سب کو وہ ہمیشہ کی زندگی دے۔" پھر ہمیشہ کی زندگی کی وضاحت ان الفاظ سے کی "اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے۔ کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تونے بھیجا ہے جانیں۔"

خداوند قدوس کے لئے تو الوہیت اور وحدانیت کی تصریح کی اور اپنے لئے رسالت کی پولس نے بھی عیسیٰ علیہ السلام کے انسان ہونے کی تصریح کی ہے۔ قیامت کے بارے میں کہتا ہے۔ "اور جب سب کچھ اس کے تابع ہو جائے گا تو بیٹا خود اس کے تابع ہو جائے گا"۔ (کرنتھیوں ۱۵: ۲۸)

پولس نے افسس کے نام اپنے ایک رسالہ میں یہی تصریح کی ہے "تمہاری بابت شکر کرنے سے باز نہیں آتا اور اپنی دعاوں میں تمہیں یاد

کرتا ہوں کہ ہمارے خداوند یسوع مسیح کا خدا جو جلال کا باپ ہے۔ تمہیں اپنی پہچان میں حکمت اور مکاشفہ کی روح بخشے"۔ (افسیوں ۱: ۱۶، ۱۷)

اس نص میں عیسیٰ علیہ السلام کے خدا سے طلب دعا کی تصریح کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توصیف "جلال کا باپ" کے الفاظ سے کی ہے۔ پولس نے اللہ تعالیٰ کو یسوع مسیح علیہ السلام کا الہ قرار دیا ہے۔ جس مسیح کو عیسائی حقیقت ثالثہ کا نام دیتے ہیں۔

پولس نے ہی اپنے ایک اور خط میں اس بات کی تصریح کی ہے۔ "کیونکہ خدا ایک ہے اور خدا اور انسان کے بیچ میں درمیانی بھی ایک یعنی مسیح یسوع جو انسان ہے"۔ (۱۔تیمتھیس ۲: ۵)

اس سلسلے میں انجیل کی ایک اور تصریح کے الفاظ یوں ہیں۔ "مگر تم ربی نہ کہلاؤ کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے یسوع مسیح اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے"۔ (متی ۲۳: ۹)

یہ نص تغایر پر دلیل ہے اپنے لئے زمین پر ایک استاد ہونے کے الفاظ استعمال کئے اور اللہ کے لئے ایک باپ کے الفاظ استعمال کئے عیسیٰ علیہ السلام جب باپ کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو خداوند قدوس اللہ مراد لیتے ہیں۔ اور اس نص میں ایک الہ کے الفاظ سے اللہ کا وصف بیان کیا۔ پھر علو مرتب کی طرف اشارہ کیا اور کہا "تمہارا باپ ایک ہے جو آسمانی ہے۔ اس نص کو متی نے اپنی نص کی چھترویں فصل میں بیان کیا ہے۔

عاجزی انسان کا خلاصہ

عجیب بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خضوع کا انکار

کرتے ہیں۔ کیونکہ خضوع الوہیت کے منافی ہے۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قیام عازر کے دوران آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اے باپ! میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تونے میری سن لی۔ اور مجھے تو معلوم تھا کہ تو میری سنتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے باعث جو آس پاس کھڑے ہیں۔ میں نے یہ کہا کہ وہ ایمان لائیں کہ تو ہی نے مجھے بھیجا ہے"۔ (یوحنا ۱۱: ۴۱، ۴۲)

متی میں ہے کہ صلیب کی رات عیسیٰ علیہ السلام نے تضرع کرتے ہوئے اللہ سے ان الفاظ میں دعا کی۔

"اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے"۔ (متی ۲۶: ۹)

مرقس میں بھی ہے۔ کہ عیسی علیہ السلام نے رب قدوس سے گڑگڑا کر دعا کی۔

"اے خدا! اے خدا! تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔ (مرقس ۱۵: ۳۴ تا ۳۴)

کیا خدا کی یہ شان ہو سکتی ہے کہ وہ موت کے پیالے کو ٹالنے کی استطاعت میں شک کرے اور آہ و زاری کرتے ہوئے اپنے محبوب سے یہ پوچھے کہ تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ اسی نص میں عیسیٰ علیہ السلام نے ارادۂ خداوندی اور اپنے ارادے میں تغایر کو بیان کیا اور فرمایا "نہ جیسا میں چاہتا ہوں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے" (مرقس: ۱۴، ۳۶)

اس تغایر کو مزید ان الفاظ میں بیان کیا "تمہارا دل نہ گھبرائے تم خدا پر ایمان رکھتے ہو مجھ پر بھی ایمان رکھو"۔ (یوحنا ۱۴: ۱)

مذکورہ الفاظ یوحنا کی انجیل کی بتیسویں فصل میں بھی موجود ہیں اسی انجیل کی ساتویں فصل میں مذکورہ مغایرات کو مزید واضح کرتے ہوئے کہا "جس نے میری بات سنی اور میرے بھیجنے والے کو مانا اس کے لئے ہمیشہ کی زندگی واجب ہو گئی۔"

پس آپ نے اپنے مرسل ہونے کی تصریح کر دی۔ اور یہ بات مسلم ہےکہ مرسل (بھیجنے والا) مرسل (بھیجا ہوا) کا غیر ہوتا ہے۔ پھر بھیجنے والے پر ایمان اور رسول جو اللہ تعالی کی طرف سے مخبر ہوتا ہے کے کلام کے سننے کو حیات ابدی کے لئے شرط قرار دیا ہے۔ ایسی تصریحات انبیاء و مرسلین کے احوال کے بارے میں عام ہیں جو کسی پر مخفی نہیں ہاں جو شخص چمکتے چاند کو نہیں دیکھ پاتا اس کے لئے اس حقیت کا اقرار ممکن نہیں۔

چھٹی نص:۔

اسے یوحنا نے اپنی انجیل کی ۲۱ فصل میں ذکر کیا ہے۔ یسوع نے انہیں کہا:

"اگر تم ابراھیم کے فرزند ہوتے تو ابراھیم کے سے کام کرتے۔ لیکن اب تم ایسے شخص کے قتل کی کوشش میں ہو۔ جس نے تم کو وہی حق بات بتائی جو خدا سے سنی" ۔ (یوحنا۸:۳۹، ۴۰)

اسی فصل میں آپ کا یہ خطاب بھی مذکور ہے:

"مجھے تمہاری نسبت بہت کچھ کہنا ہے اور فیصلہ کرنا ہے لیکن جس نے مجھے بھیجا وہ سچا ہے اور جو میں نے اس سے سنا وہی دنیا سے کہتا ہوں" (یوحنا۸:۲۶)

اسی فصل کے چند اور الفاظ قابل توجہ ہیں:

"کیونکہ میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اسی نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ کیا کہوں اور کیا بولوں اور میں جانتا ہوں کہ اس کا حکم ہمیشہ کی زندگی ہے۔ پس جو کچھ میں کہتا ہوں جس طرح باپ نے مجھ سے فرمایا ہے۔ اسی طرح کہتا ہوں"۔ (یوحنا ۱۲: ۴۹' ۵۰)

اس نص میں آپ علیہ السلام نے اپنے انسان ہونے کی تصریح کر دی۔ اور کہا میں انسان ہوں وہی حق بات کہتا ہوں جو اللہ تعالیٰ مجھے حکم دیتا ہے۔

پولس' عبرانیوں کے نام اپنے ایک خط میں عیسیٰ علیہ السلام کے رسول محض ہونے کی تصریح ان الفاظ میں کرتا ہے:

"اس رسول اور سردار کاہن یسوع پر غور کرو جس کا ہم اقرار کرتے ہیں۔ جو اپنے مقرر کرنے والوں کے حق میں دیانتدار تھا۔ جس طرح موسیٰ اور اس کے سارے گھر میں تھا"۔ (عبرانیوں ۳ :۱'۲)

یعنی عیسیٰ علیہ السلام بھی راہبوں میں سے ایک راہب تھے۔ اللہ نے انہیں بھیجا تھا اور وہ اللہ کے حق میں مخلص تھے۔ ان کی حیثیت سارے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی طرح تھی۔ سارے گھر سے مراد وہ تمام اقوام ہیں جن کی طرف سے آپ مبعوث ہوئے تھے۔ بقیہ کلام میں عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں پولس کا یہ قول بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ گھر سے مراد تمام لوگ ہیں الفاظ یوں ہیں:

"اللہ کا گھر ہم تمام مومنین ہیں۔" (عبرانیوں ۳: ۶)

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اللہ کے گھر سے مراد عیسیٰ علیہ السلام

کی امت ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت اپنی امت میں موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آپ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اس سے بڑھ کر عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی اور تصریح کیا ہوگی۔

اسی خط میں آگے چل کر وہ مزید وضاحت کرتا ہے:

"چنانچہ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی بنانے والا ہوتا ہے۔ مگر جس نے سب چیزیں بنائیں وہ خدا ہے۔" (عبرانیوں ۳: ۴)

یعنی دو رسولوں میں سے ہر ایک سے ان کی امت راہنمائی پاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں جو تمام کو ہدایت دیتا ہے وہ اللہ ہے۔

انجیل کی ایک اور تصریح میں اس تاویل کی تائید کرتی ہے۔

"انگور کا حقیقی درخت میں ہوں اور میرا باپ باغبان ہے" (یوحنا ۱۵: ۱)

یوحنا نے فارقلیط کی فصل میں اس نص کو صراحۃً بیان کیا ہے۔ انگور کے حقیقی درخت کا معنی اللہ کا بندہ کیا گیا ہے۔

سوال:

ایک نکتہ ابھی تشنہء گفتگو ہے کہ مذکورہ نوعیت کے مجاز کا اطلاق مثلاً "حلول" میں اور باپ ایک ہیں نہ تو ہماری شریعت میں جائز ہے اور نہ پہلی کسی اور شریعت میں عیسیٰ علیہ السلام بھی صاحب شریعت نبی ہیں۔ تو یہ اطلاق ان کی شریعت میں کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

جواب

ہر شریعت کے کچھ مخصوص احکام ہوتے ہیں۔ آپ علیہ السلام پر ان نصوص کا اطلاق ہوا تو آپ علیہ السلام نے ظاہری معنی مراد لینے سے

احتراز کیا۔ تاکہ شبہ کا ازالہ ہو جائے۔ تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان الفاظ کا اطلاق ان کی شریعت میں جائز تھا۔ اسی طرح اللہ کے لئے باپ کا لفظ اور عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بیٹے کا لفظ مجازا" استعمال ہوتے تھے۔ عنقریب ہم ذکر کریں گے کہ اس اطلاق کی صحت کس اعتبار سے تھی۔

اس گفتگو کے بعد مخالف کے لئے کوئی عذر نہیں رہا۔ کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا درجہ دے۔ جبکہ آپ نے خود ہی انسان اور اللہ کے رسول ہونے کی تصریح کردی۔ ایک عبد کی حیثیت سے آپ نے ان احکامات کی اطاعت کی۔ جن کا آپ کو حکم دے دیا گیا تھا۔ ان نصوص کی تاویل کر دی جو ظاہرا" اتحاد پر دلالت کرتی تھیں۔ یہود پر مثالوں کے ذریعے واضح کر دیا کہ وہ خدا نہیں۔

انجیل میں ایسی نصوص بھی ہیں جن میں عیسیٰ نے اپنی رسالت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا۔ اللہ کے حضور بڑی عاجزی سے دست بدعا ہوئے اپنے شاگردوں کے لئے احسان عظیم کی التجا کرتے ہوئے یوں عرض کناں ہوئے۔

"اپنے اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے مجھے بخشا ہے ان کی حفاظت کر۔" (یوحنا ۱۷:۱۱)

اسی طرح ایک اور التجا کی۔

"انہیں سچائی کے وسیلہ سے مقدس کر۔" (یوحنا ۱۷:۱٦)

جب اس متلون المزاج آدمی سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ تو وہ ان نصوص کو عیسیٰ علیہ السلام کے انسان ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ ناسوت پر محمول کرتا ہے۔ اور جو نصوص ظاہر ہیں۔ اور ان کی تاویل نہیں ہو سکتی انہیں لاہوت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ دیکھیے اللہ نے اسے کیسے اندھا کر دیا

ہے۔ کہ کبھی تو خدا کو انسان مانتا ہے۔ اور کبھی الہ تعالی عما یقولون علوا کبیرا اس باطل اور دور از قیاس نظریئے کا بطلان بہت ضروری ہے۔ ہماری رائے میں عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کے جسم کو پیدا کیا۔ پھر خود ہی اس جسم میں ظہور فرمایا۔ اس طرح عیسیٰ علیہ السلام خدا ٹھہرے اور خدا تعالیٰ عیسیٰ قرار پائے۔ ان کے نزدیک اتحاد کا مفہوم یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ کے درمیان وہی تعلق ہے۔ جو جسم اور روح کے درمیان ہے۔ پھر اس تعلق کی وجہ سے ایک تیسری حقیقت ثابت ہو گئی۔ جو ان دونوں حقیقتوں سے مختلف ہے۔ یہ حقیقت لاہوت اور ناسوت سے مرکب ہے اور ان دونوں حقیقتوں کے لئے جن اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ وہ حقیقت ان اوصاف سے بیک وقت متصف ہے۔ عیسائیوں نے اس تیسری حقیقت کو ثابت کر کے کئی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ ان عیوب کو چھپاتے مگر اذا فاتک الحیاء فافعل ماشئتہ۔ وہ اس تیسری حقیقت کے لئے تمام انسانی صفات (من حیث الانسان) اور تمام خدائی صفات (من حیث لا الہ) ثابت کرتے ہیں۔ اور اسے ان تمام مذکورہ صفات میں انسان اور اللہ تعالیٰ کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ مگر یہ اعتقاد بھی رکھتے ہیں۔ کہ یہ حقیقت دونوں حقیقتوں (انسان اور خدا) سے مختلف ہے۔ اور اس تیسری حقیقت کا نام یسوع مسیح ہے۔ ان کا یہ نظریہ محض نادانی اور حقیقت سے کھلی روگردانی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

حقیقت ثالثہ کا عقیدہ

طلب الابلق العقوق فلما
لم ینلہ اراد بیض الانوق

اس نے حاملہ گھوڑے (ناممکن) کی طلب کی جب نہ پا سکا تو اونٹنیوں کے انڈوں کا ارادہ کر لیا۔

ان پر یہی مثال صادق آتی ہے کیونکہ وہ ذات باری تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان وہی تعلق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو روح اور جسم کے درمیان ہے۔ اور جب ثابت نہیں کر سکتے تو محض امکان کی بناء پر بغیر کسی دلیل کے ایک ناممکن چیز کا دعویٰ کر دیتے ہیں۔ بھلا ایک محال کے اثبات کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

تیسری حقیقت کے محال ہونے کی وجہ

تیسری حقیقت کے محال ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ کسی بھی مرکب چیز کا وجود مختلف اجزاء اور ایک ترکیب خاص پر موقوف ہوتا ہے۔ جس سے یہ لازم آتا ہے۔ کہ یہ حقیقت تب ہی پائے گی۔ جب اس کے اجزاء پائے جائیں گے۔ پھر اس کے اجزاء میں سے ہر جز کے لئے جزئیت ثابت ہو سکے گی۔ پھر اس جزئیت کی ایک ترکیب ہو گی۔ جس میں یہ خاصیت ہو گی۔ کہ وہ دوسرے اجزاء سے مل سکے۔

اب دیکھئے اس تیسری حقیت کا ایک جز تو لاہوت ہے اور دوسرا جز ناسوت اور ناسوت صفت جزئیت اور ایک ترکیب خاص جو دوسروں میں ملنے کی خاصیت رکھتی ہو۔ لاہوت کے لئے بھی ثابت کرتا ہے گویا لاہوت انسان کا محتاج ہے۔ جو کہ محال ہے۔ جس کا بطلان پہلے کیا جاچکا ہے۔

لاہوت انسان کا اس وقت محتاج ہو گا۔ جب ترکیب سے مراد امتزاج اتحاد اور مجاورت نہ ہو۔ اور اگر ترکیب سے یہی مراد ہو تو بات مزید بگڑ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ یہ کہیں کہ اس ترکیب کی حقیقت معلوم نہیں کی جا سکتی تو ہم جواب دیں گے کہ عقل سلیم کی مخالفت اور امر غیر معقول کا یقین حماقت اور فریب ہے۔

سوال

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ناسوت کو تخلیق کیا۔ پھر اس میں حلول فرمایا تو اس طرح اللہ کی ایک اور صفت پیدا ہو گئی اور وہ صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے متحد ہوا اور اس میں ظہور فرمایا۔

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ صفت واجب الوجود ہے تو اسکا حدوث سے متصف ہونا محال ہے۔ اور اگر ممکن الوجود ہے تو اس کا باری تعالیٰ کی صفت قرار پانا ناممکن۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات واجبۃ الوجود ہیں۔ اور ان صفات کا عدم وجود بالکل محال ہے۔

اعتراض:۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ اتحاد سے اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفت وجود میں آئی تو اس طرح پورے عالم کی تخلیق ناممکن بن جاتی ہے۔ بلکہ کسی بھی فرد کی تخلیق محال قرار پاتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب کسی فرد کو پیدا فرمایا تو اس کی ایک صفت خالقیت کا حدوث لازم آیا جو ناممکن ہے۔

جواب:۔

عالم کی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کی صفت کا حدوث لازم نہیں آتا۔ کیونکہ باری تعالیٰ کے خالق ہونے کا مفہوم یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ازل سے خالق ہے اور یہ صفت خالقیت ازل سے اس ذات کے لئے ثابت ہے۔ پس جب اس نے مخلوق کو پیدا کیا تو تخلیق کے وقت کا علم اور تخلیق کی قدرت ازل سے ثابت ہے۔ مخلوق کی پیدائش کے بعد صرف مخلوق کی پیدائش وجود میں آئی ہے۔ جو مخلوق کی صفت ہے نہ کہ خالق کی۔ رہی یہ بات کہ تخلیق میں اثر تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوا تو یہ نسبت اور اضافت ہے۔ اور نسبت اور اضافت ایسے امور ہیں۔ جن کا وجود نہیں ہوتا مثلاً اوپر نیچے باپ بیٹا وغیرہ اور یہ معنی بالکل ظاہر ہے جو پہلے معنی سے مختلف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کو ناسوت سے متحد گمان کرنا اس کے لئے ایک نئی

صفت کو تسلیم کرنا ہے۔ جبکہ ایسا ناممکن ہے۔

بفرض محال اگر اس تیسری حقیقت کو تسلیم بھی کر لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ تیسری حقیقت لاہوت اور ناسوت دونوں سے مختلف ہے۔ اور انسان اور اللہ کی تمام صفات اور لوازمات سے بیک وقت متصف بھی ہے تو یہ محض بے فائدہ گفتگو ہو گی۔ جس کی تحقیق کی نہ کوئی حد ہو گی نہ کوئی فائدہ۔

اسے تفصیلاً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کوئی چیز تب ہی کسی صفت سے متصف ہو سکتی ہے۔ جب اس صفت کا ثبوت اس ذات کے لئے ممکن ہو۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی تو اب دیکھئے اس تیسری حقیقت پر نہ تو لاہوت کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی ناسوت کے۔ کیونکہ جو صفات لاہوت کے لئے ثابت ہیں۔ وہ الہ ہونے کے ناطے اس کے ساتھ خاص ہیں۔ اور یہی صفات اللہ کو غیر اللہ سے ممتاز کرتی ہیں۔ اگر ان صفات کو حقیقت ثالثہ کے لئے ثابت کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ وہ حقیقت لاہوت کا عین ہے۔ بعینہٖ یہ تیسری حقیقت ناسوت کا بھی عین قرار پائے گی۔ کیونکہ وہ تمام صفات جو ناسوت کے لئے ثابت ہیں وہ تیسری وہ اس تیسرے حقیقت کے لئے ثابت کرنا پڑیں گی۔ اگر ایسی صورت میں مغایرات ثابت کی جائے تو لازم آئے گا۔ کہ عیسیٰ کے لئے تمام صفات انسانی اور عوارض انسانی ثابت ہیں۔ مگر آپ انسان سے مختلف ہیں۔ اور یہ بات بالکل محال ہے۔ جب کسی فرد میں تمام انسانی صفات پائی جائیں گی۔ تو اس فرد پر انسان کا اطلاق لازم آئے گا۔ اور وہ فرد کسی صورت میں بھی غیر انسان نہیں ہو سکے گا۔ یا پھر لازم آئے کہ یہ صفات انسان میں موجود ہی

نہیں۔ یہ بات یقینی ہے۔ کہ تیسری حقیقت محض مفروضہ ہے جس کا وجود عنقاء ہے۔

اگر یہ تیسری حقیقت الہ کامل ہو تو اس کے لئے ایک کامل الہ کے اوصاف کا ثبوت لازم ہے۔ اور الہ کامل کے اوصاف یہ ہیں۔ کہ وہ الوہیت اور انسانیت کا مرکب نہ ہو۔ کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ باری تعالی وجود میں انسان کا محتاج ہے۔ اور انسان سے اور اپنی ذات سے مسبوق ہے۔ جو قوم ایسی واضح غلطی کو نہیں سمجھ سکتی اس کی ہدایت مشکل ہے۔

اعتراض

اللہ کا محتاج ہونا تو تب لازم آئے گا۔ جب ہم تیسری حقیقت کو ان تمام صفات سے متصف مانیں۔ جو باری تعالی میں من حیث الہ میں پائی جاتی ہیں۔ اور ان صفات سے بھی متصف مانیں جو انسان میں من حیث انسان پائی جاتی ہیں۔ مگر جب ہم لاہوت اور ناسوت میں سے ہر ایک پر وہ تمام احکام جاری کریں۔ اور ان تمام صفات کو تسلیم کریں۔ جو ترکیب سے پہلے ان دونوں کے لئے ثابت ہیں۔ تو پھر اتحاد کیسے ناممکن ٹھہرے گا۔

جواب:۔

ناسوت اور لاھوت میں سے ہر ایک کے لئے جن احکامات کا پایا جانا ضروری ہے اگر ان کا اعتبار ترکیب کی قید کے بغیر کیا جائے تو حقیقت ثالثہ کا اعتبار محال ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مفرد پر بحیثیت مفرد حکم لگاتا ہے۔ اور اگر ان دونوں میں سے ہر ایک کا اعتبار بقید ترکیب کیا جائے تو ترکیب کے بعد لاھوت اور ناسوت کی تمام صفات کا استحالہ لازم آتا ہے۔ کیونکہ دونوں مفردوں میں سے ہر ایک کے لئے تمام لوازمات ترکیب کے بعد بھی

باقی رہیں۔ تو تیسری حقیقت کے لئے بھی ان لوازمات کا ثبوت ثابت ہو جائے گا۔ اس طرح مذکورہ استحالہ پھر بھی لازم ٹھہرے گا۔ کیونکہ حقیقت ثالثہ لاہوت کا بھی عین قرار پائے گی۔ اور ناسوت کا بھی۔ اس لئے کہ بحیثیت الہ اور بحیثیت انسان لاہوت اور ناسوت میں سے ہر ایک کے لئے جو لوازمات ثابت ہیں۔ ان میں حیقیقت ثالثہ بھی شریک ہوگی۔ سو اس سے یہ بات واضح ہو گئی۔ کہ خواہ ہم ترکیب کی قید کے بغیر لاہوت اور ناسوت کے لوازمات سے حقیقت ثالثہ کو متصف کریں۔ یا بقید ترکیب دونوں صورتوں میں یہ اعتبار ممتنع ٹھہرتا ہے۔ یہ مباحث وقت نظر کے متقضی ہیں۔ ایک جاہل مطلق کا اعتقاد کہ وہ اس مشکل مسئلہ سے باسانی نجات حاصل کر لے گا۔ اور ادھر ادھر کی مثالیں دے کر ان لانخل گتھیوں کو سلجھا لے گا۔ کم عقلی کی انتہا ہے۔

سوال

مخالف کی رائے یہ ہے کہ انسان جسم' احساس' نمو' تغیر اور فساد جیسی جسم سے تعلق رکھنے والی صفات سے متصف ہے۔ وہ ذو حیز ہے اور نطق کلیات و جزئیات کا اور فہم و فراست جیسی نفس سے تعلق رکھنے والی صفات سے بھی متصف ہے۔

جواب

ہمارے نزدیک ان احکامات پر اعتقاد تب ممکن ہو گا۔ جب انسان کو حیوانیت اور روحانیت ہر دو اعتبار سے دیکھا جائے۔ ؎ عیسائیوں کے مذکورہ هذیان کو ہمارے رد کردہ نظریہ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک حقیقت ثالثہ میں دونوں خدائی اور انسانی صفات بیک وقت

موجود ہیں۔ اس لئے یہاں ایسی مثال درکار ہے جو عین اس عقیدہ کے ثبوت میں سود مند ہو سکے۔ یہ تب ہو گا کہ انسان کو مجرد تسلیم کیا جائے۔ یعنی یہ یقین کر لیا جائے کہ انسان نہ تو جسم ہے۔ نہ وہ کسی جسم میں حلول کئے ہے۔ اور نہ ہی ذو حیز ہے۔ وہ باقی ہے فانی نہیں۔ کیونکہ عیسائی اس مسئلہ میں فلسفے پر اعتماد رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ان تمام صفات کو ثابت کرتے ہیں۔ جو نفس میں بحیثیت نفس موجود ہیں۔ پھر متضاد صفات کو بھی لازم ٹھہراتے ہیں۔ جو جسم کا خاصہ ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ انسان جنسی طبعی ہے یہ جنس مختلف افراد میں حدا" اور حقیتا پائی جاتی ہے۔ اور انسان اس جنس کا حصہ ہے۔ وہ دو حیز' متحرک اور قابل فساد ہے۔ میرے نزدیک ایسی گفتگو محض یا وہ گوئی ہے۔ جو شخص اس حقیقت ثالثہ کے لئے وہ صفات ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جن سے متصف ہونا حقیقت ثالثہ کے لئے ہے ہی محال تو کوئی بعید نہیں کہ ایسا شخص بدیہی چیزوں کا انکار کر دے اور محال چیز کو لازم قرار دے۔

تعجب ہے۔ عیسائی مذہب کے ماننے والے واضح امور سے بھی غافل ہیں۔ اور علم کے دعویٰ کے باوجود یہ اعتقاد رکھتے ہیں۔

اعتراض:۔

یہ استحالہ تو تب لازم آئے گا۔ کہ ہم اس ترکیب سے امتزاج اور اختلاط مراد لیں۔ جبکہ ہمارا نظریہ یہ نہیں۔ بلکہ ہمارے نزدیک یہ ترکیب معنوی ہے۔ یعنی لاسوت اور ناسوت کے درمیان پایا جانے والا تعلق معنوی ہے۔

جواب:۔

اس اعتراض کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ جیسا کہ گذشتہ اوراق میں اس امر پر گفتگو ہو چکی ہے۔ کہ انسان اور الہ کے درمیان نسبت عامہ ہو یا مقیدہ دونوں محال ہیں۔ درحقیقت حقیت ثالثہ کے متعلق یہ نظریہ یعقوبیؒ کا ہے۔ ملکیؒ کی رائے اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔ جسے سن کر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ اور انسان سوچنے لگتا ہے۔ کہ کیسے کیسے داناؤں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے محروم فرما دیا۔ اور ان کے دلوں اور آنکھوں پر مہر ثبت کر دی ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ذات باری تعالیٰ دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ دونوں میں کوئی اختلاف اور امتزاج نہیں۔ بلکہ ہر حقیقت اپنے اوصاف پر باقی ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام حقیقت الہ کے اقنوم ہیں۔ حقیقت عیسوی غیر مرکب ہے۔ جو انسان اور الہ دونوں مذکورہ حقیقتوں سے ماخوذ ہے۔ اور انسان کے ساتھ اس کا مکمل اتحاد ہے۔

دیکھیے! کیسی بے ہودہ گفتگو ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کو گمراہ رکھنا چاہتا ہے۔ تو اس کے دل میں کیسے کیسے شبہات پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے گمراہ شخص کو واضح راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

یہ لوگ کیسے اللہ کی حقیقت کو انسانی اور خدائی حقیقت سے ماخوذ مان رہے ہیں۔ اور پھر اس کا انسان کلی کے ساتھ اتحاد ثابت کر رہے ہیں۔ حالانکہ انسان کلی کا خارج میں کوئی وجود ہی نہیں۔ گویا حضرت عیسیٰ کا تعلق اس فرد سے ہے۔ جس کا وجود صرف ذہن میں ہے خارج میں نہیں۔ اس سے لازم آتا ہے۔ کہ (نعوذ باللہ) عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ اللہ تعالیٰ

مصلوب ہوئے۔

اس قیاس کو ہم منطقی زبان میں یوں بیان کریں گے۔

مسیح مصلوب ہوا اور جو مصلوب ہوا وہ خدا نہیں لہٰذا مسیح خدا نہیں۔

عیسائی کبریٰ کو کسی صورت میں نہیں جھٹلا سکتے۔ وہ لوگ حقیقت مسیح کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس حقیت اور متحدبہ کا خارج میں وجود نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا۔ کہ مسیح مصلوب کو انسان کلی سے ایک نسبت ہے جس کا تصور صرف ذہن میں ہے۔ اس سے ہمارا اعتراض رد نہیں ہوتا۔ کیونکہ پہلے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ان نسبتوں کا کوئی وجود نہیں۔ اگر ہم تسلیم کر بھی لیں تو تب بھی اعتراض باقی رہتا ہے۔ کیونکہ نسبتوں کو اور انسان کلی کو نہ تو سولی دی جا سکتی ہے نہ ہی تکلیف۔

اگر یہ کہا جائے کہ نوع کلی طبعی خارج میں موجود ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ اس سے یہ لازم آئے گا۔ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ افراد انسانی میں سے ہر فرد کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے۔

اعتراض:۔

اگر مراد عیسیٰ علیہ السلام کے حصے کی خصوصیت ہو تو اعتراض اٹھ نہیں جائے گا۔؟ قطع نظر اس کے کہ آپ کی شخصیت آپ کو غیر سے ممتاز کرتی ہے یا نہیں۔

جواب:۔ یہ اعتبار ذہنی ہے جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ بلکہ اس حصے کا وجود آپ کی شخصیت کے لئے ملزوم ہے۔ پس اس

سے اللہ تعالیٰ کا انسان جزئی کے ساتھ اتحاد لازم آئے گا۔ عنقریب ہم اس رائے کا بطلان کریں گے۔

پھر حقیقت الہ کو انسان اور الہ دونوں حقیقتوں سے بیک وقت ماخوذ تصور کیا جائے۔ تو لازم آئے گا کہ وجود جو تشکیل پا رہا ہے وہ الہ ہے۔ جس میں وہ تمام صفات پائی جا رہی ہیں جو الہ میں پائی جاتی ہیں۔ پھر یہ بھی لازم آئے گا۔ کہ یہ وجود جو دونوں حقیقتوں سے ماخوذ ہے۔ حقیقت الہ سے پہلے موجود ہے۔ اور مذکورہ صفات سے متصف بھی ہیں۔ تب ان صفات سے متصف حقیقت الہ ان دونوں سے مقدم ٹھہرے گی۔ اور یہ حقیت ہے کہ رب قدوس کی صفات واجب الوجود ہیں۔ جو ازل سے ذات باری تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں۔ نیز ان حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یعنی انسان وجود باری تعالیٰ کے لئے شرط ٹھہرے گی۔ جو قطعی طور پر حادث ہے۔ تو حادث اس قدیم کے لئے شرط کیسے بنے گا جو ازل سے موجود ہے۔

یہ تمام گفتگو تو اس وقت ہو گی جب اخذ سے مراد یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اس طرح ایک صفت پیدا ہوئی ہے جب اس نے ناسوت کو پیدا کیا ہے اور اگر الہ کا مقصد یہ ہو گا کہ دونوں حقیقتیں ذات باری تعالیٰ کے وجود کے لئے شرط ہیں تو ایسا سوچنا بے وقوفی ہے۔

یہ رائے قدماء کی ہے۔ متاخرین بھی اتحاد کے علاوہ باقی امور میں قدماء جسی رائے رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں مسیح علیہ السلام کا انسان جزئی کے ساتھ اتحاد ہے۔ مسیح علیہ السلام فریقین کے نزدیک حقیقت الہ کا فقط اقنوم ہیں۔ یہ حقیقت (حقیقت عیسوی) غیر مرکب ہے۔ جو دونوں حقیتوں سے ماخوذ ہے۔ یعنی حقیت الہ سے اور حقیت انسانی سے۔ پھر ہر حقیقت اتفاقاً

بغیر امتزاج اور اختلاط کے اپنی اصل پر اپنے تمام اوصاف کے ساتھ باقی ہے۔ بلکہ ہر حقیت اپنی اصل کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ مسیح علیہ السلام حقیقت الہ کے فقط اقنوم ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کو دار پر کھینچنے کے عقیدہ سے فریق ثانی بھی اس قباحت کا ارتکاب کرتا ہے۔ جس کا ارتکاب فریق اول کرتا آیا ہے۔

پہلے فریق (قدماء) کے متعلق تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ دوسرا فریق بھی گمراہی سے دوچار ہے۔ کیونکہ اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ مسیح علیہ السلام حقیقت الہ کے فقط اقنوم ہیں۔ حقیقت عیسوی نہ تو مرکب ہے اور نہ ہی حقیقت الہ اور حقیقت انسان کے درمیان اختلاط و امتزاج ہے۔ اس کے باوجود کہتے ہیں کہ آپ کو سولی دی گئی۔ جس سے لازم آتا ہے۔ کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو سولی دی گئی۔

اعتراض:۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب دونوں فریق اتحاد کے قائل ہیں۔ تو ذات باری تعالیٰ کو سولی نہ دیا جانا ان کے نزدیک ثابت کیوں نہیں ہوتا۔

جواب:۔

اگر چہ ان کا عقیدہ یہی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام حقیت الہ کے اقنوم ہیں۔ مگر سولی عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نہیں دی گئی۔ اس دعویٰ کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ کہ ایک کا مصلوب ہونا دوسرے کے مصلوب ہونے کے لئے کیسے لازم نہیں ٹھہرتا۔

قدماء کے نزدیک متحد۔ کا تصور صرف ذہن میں ہے۔ ان کے نزدیک حقیقت مسیح غیر مرکب ہے۔ رہے متاخرین تو ان کا نظریہ بھی یہی ہے۔ بس اتحاد کے بارے میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ان کے نزدیک اتحاد سے

مراد انسانی جزئی سے ایک خاص نسبت ہے۔

تعجب ہے۔ کہ مسیح علیہ السلام جو حقیقت الہ کا اقنوم ہیں۔ مصلوب ہوئے جب کہ یہ اعتراف بھی ہے۔ کہ اس حقیقت کا اعتراف نا ممکن ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایک سلیم الطبع شخص کے لئے حقیقت الہ کے اقنوم مسیح علیہ السلام کو دار پر کھینچے کا عقیدہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات کیونکر تسلیم ہو سکتی ہے۔ کہ اس حقیقت کا ادراک نا ممکن ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی تکلیف سے اللہ تعالیٰ کو تکلیف نہیں ہو سکتی۔

اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ وہ ایسی چیز کو مانتے ہیں جس کی حقیقت کو وہ جانتے تک نہیں۔ اور پھر اس جہالت کا واشگاف الفاظ میں ذکر بھی کرتے ہیں۔ بھلا اس شخص کے لئے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ جو یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ماننے کی وجہ وہ نصوص ہیں۔ جو اتحاد پر دلالت کرتی ہیں۔ نیز وہ معجزات جو آپ کے ہاتھوں صادر ہوئے۔ یہ عقیدہ واضح گمراہی اور جہالت کے اعتراف کے مترادف ہے اور جو لوگ مقامات علوم کو جانتے تک نہیں اور نہ ہی ان کے پاس ایسی عقل ہوتی ہے۔ جو انہیں جہالت سے بچائے۔ تو ان کے لئے ایسا عقیدہ رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اتحاد کا اطلاق تو غیر عیسیٰ پر بھی ہوتا ہے۔ جسے ہم تفصیلاً بیان کر چکے ہیں۔

عاجزی خدائی کے منافی ہے

رہا معجزات کا صدور تو یہ بات دوسرے انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی ثابت ہیں۔ اس بات کا انکار کیسے ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے عازر میں قیام کے دوران اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی سے سوال کیا۔

آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر عرض کی۔

"اے باپ میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تو نے میری سن لی اور مجھے تو معلوم تھا کہ تو ہمیشہ میری سنتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے باعث جو آس پاس کھڑے ہیں میں نے کہا تاکہ وہ ایمان لائیں کہ تو نے ہی مجھے بھیجا ہے۔" (یوحنا باب ۱۱: آیت نمبر ۴۲، ۴۳)

آپ نے اپنے شاگردوں کے لئے تقدیس اور حفاظت کا سوال کیا۔

"انہیں سچائی کے وسیلہ سے پاک کر۔" (یوحنا ۱۷: ۱۷)

"اپنے اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے مجھے بخشا ہے۔ ان کی حفاظت کر۔" (یوحنا ۱۷: ۱۱)

آپ نے اللہ تعالیٰ سے آہ و زاری کی اور نجات کے امکان میں تردد کا اظہار کیا۔

"اور ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔ نہ جیسے میں چاہتا ہوں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے"۔ (متی ۲۶: ۳۹)

آپ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا۔

"اے میرے خدا!! اے میرے خدا!! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔ (مرقس ۱۵: ۳۴)

آپ کی ذات باری تعالیٰ کے لئے علم خاص کی اپنی ذات کے لئے نفی کی۔

"لیکن اس دن یا اس گھڑی ...... نہ بیٹا مگر باپ اکیلا"۔ (مرقس ۱۳: ۳۲)

اپنی رسالت اور انسان محض ہونے کی تصریح کی۔

"لیکن اب تم مجھ جیسے شخص کے قتل کی کوشش میں ہو۔
جس نے تم کو وہی حق بات بتائی جو خدا سے سنی۔" (یوحنا ۸: ۴۰)

اپنے آپ کو مامور من اللہ کہا۔

"جیسا باپ نے مجھے حکم دیا ایسا ہی میں کہتا ہوں۔"

اسی بات کی شہادت آپ کے عظیم تلامذہ نے دی۔ وہ ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ وہ معجزات جن کا ان کے ہاتھوں صدور ہوا اللہ کی طرف سے تھے۔

"یسوع ناصری ایک شخص تھا۔ جس کا خدا کی طرف سے ہونا تم پر ان معجزوں اور عجیب کاموں اور نشانیوں سے ثابت ہوا۔ جو خدا نے اس کی معرفت تم میں دکھائے"۔

(اعمال باب 2 آیت نمبر23,22)

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ حالت ہے تو ایک عقل مند انسان عقل و نقل کے کلیتہً خلاف چیز کو اپنا عقیدہ کیسے بنالے۔

نسطوری فرقہ کی رائے

نسطوری کہتے ہیں۔ کہ اتحاد مشیت میں واقع ہوا ہے۔ یہ نظریہ بھی بالکل بودہ ہے۔ اسے تحریر کرنا ضروری ہے اگر مراد یہ ہے کہ مشیت عیسوی احکام خمسہ میں مشیت الٰہی کے تابع ہے۔ واجب' حرام' مستحب' مکروہ اور مباح میں دونوں مشیتوں کے درمیان ذرا بھی تباین نہیں تو یہ بات تو تمام انبیاء کے لئے بھی ثابت ہے۔ بلکہ اولیاء کے لئے بھی ثابت ہے۔ جو نبوت کے درجے پر فائز نہیں ہوتے۔ اگر مراد یہ ہے کہ

کائنات میں مشیت الٰہی جن چیزوں سے متعلق ہے۔ مشیئت عیسوی بھی ان چیزوں سے متعلق ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ ایسا تصور کرنا بھی عقلمند کو زیبا نہیں۔ اسے عقیدہ بنانا تو بہت دور کی بات ہے۔

بھلا یہ دعویٰ کیسے ممکن ہے۔ جبکہ مشیت الٰہی تو یہ تھی کہ مسیح علیہ السلام مصلوب ہوں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام سولی سے بچنا چاہتے تھے۔ (اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ صلیب پر آہ و زاری کرنے والا شخص یہوداہ اسکریوتی تھا نہ کہ مسیح علیہ السلام۔ امام غزالی الزامی گفتگو کر رہے ہیں۔ مترجم) جیسا کہ آپ کی عاجزانہ دعا سے ظاہر ہے۔

"اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔ نہ جیسے میں چاہتا ہوں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے"۔

دونوں مشیتوں میں تغایر کی تصریح کر دی۔ اور پھر سولی کا سبب بھی پوچھا۔

"اے خدا!! اے خدا!! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔

یہ نص شاہد ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معلوم نہیں تھا کہ مجھے سولی کیوں دی جا رہی ہے۔ اور جو واقعہ کی حقیقت کا ادراک بھی نہ رکھتا ہو تو وہ اس واقعہ کا ارادہ کیسے کر سکتا ہے۔

اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام چاہتے تھے کہ تمام بنی اسرائیل ان کی بات مانیں اور ہدایت قبول کریں۔ یہی انبیاء کی شان ہے۔ حالانکہ مشیت ایزدی یہ نہ تھی کہ تمام بنی اسرائیل ہدایت قبول کریں۔ کیونکہ تمام بنی اسرائیل نے ہدایت کو قبول نہ کیا اسی طرح وقوع قیامت ایک خاص وقت میں مشیت ایزدی میں تھی اور مسیح علیہ السلام اس وقت کو نہیں جانتے تھے۔ تو عیسیٰ علیہ السلام کی مشیت وقوع قیامت کے متعلق کیسے ہو

سکتی ہے۔

پھر عیسیٰ علیہ السلام نے انجیر کے درخت کا قصد فرمایا۔ مشیت ایزدی یہ تھی کہ آپ درخت کا قصد کریں اور درخت بے ثمر ہو حالانکہ مسیح علیہ السلام کو درخت کے بے ثمر ہونے کا علم نہ تھا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم اس بحث کو چھوڑتے ہیں۔ ان نصوص کا سیاق و سباق کے حوالے سے جب مطالعہ کیا جائے۔ تو تمام وجوہات سامنے آجاتی ہیں۔

لفظ الٰہ کا مفہوم

عیسائی مسیح علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں۔ نہ جانے اس سے مراد تعظیم ہے یا کچھ اور۔ کیونکہ الہ ہر عظیم ذات کو کہتے ہیں۔ اگر الہ سے مراد ان کی قابل عبادت ذات ہے۔ تو دنیا بھر میں اس گروہ سے بڑھ کر عقل وخرد سے عاری اور کوئی گروہ نہیں ہو گا۔

عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ماننے کی وجہ دراصل وہ نصوص ہیں

جن کو یہ لوگ ظاہر پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا صحیح مفہوم مجاز پر محمول کر کے حاصل ہو سکتا ہے۔

ہر شریعت میں کئی الفاظ اپنے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے خلاف عقل ہوتے ہیں۔ ایسے الفاظ کو علماء مجاز پر محمول کرتے ہیں۔ ہماری شریعت میں کئی الفاظ اکابر صوفیاء کی طرف منسوب ہیں۔ جو ظاہرا" خلاف عقل ہیں مثلاً" کسی صوفی نے کہا "سبحانی" کسی نے کہا "ما اعظم شانی" منصور حلاج نے کہا "انا اللہ" (میں خدا ہوں) "مافی الجبۃ الا اللہ" (اس جبہ میں خدا ہی ہے)۔

شریعت اسلامیہ کے علماء نے ان اقوال کی تاویل کی ہے۔ کہ صوفیاء پر بعض اوقات ایسے حالات طاری ہوتے ہیں کہ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایسے الفاظ ایسی ہی کیفیات میں ان کی زبان سے نکلتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ صوفیاء کبھی سکر کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اور سکر کی کیفیات کو مخفی رکھا جاتا ہے۔ بیان نہیں کیا جاتا۔ چونکہ یہ الفاظ ظاہرا" عقل کے خلاف ہیں۔ اس لئے یہ تمام گفتگو ہوتی ہے اور ان کی تاویل کی جاتی ہے۔

عیسائی ایک دوسرے کو اتنے تنگ رستوں پر چلنے کی تلقین کر کے لوگوں کی ہنسی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اور ان کی عصبیت کی رگ تک نہیں پھڑکتی۔ جس مشکل میں وہ اپنے آپ کو ڈالتے ہیں۔ اس سے نکلنے کی انہیں کھلی چھٹی ہے بھلا وہ شخص جو جان بوجھ کر ایک کلام کو دور از قیاس معنی پر محمول کرنے پر تلا ہوا ہو اسے اس سے کیا غرض کہ عقل سلیم کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔

حلول کی اطلاق کی نوعیت کے بارے میں میں پہلے گفتگو ہو

چکی ہے۔

خدا (رب) کے لفظ سے الوہیت کا ثبوت صحیح نہیں

لفظ رب مشترک ہے۔ اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی ہوتا ہے۔ اور مالک پر بھی۔ کہا جاتا ہے رب المنزل (گھر کا مالک) رب المال (مال کا مالک) عیسائیوں کے نزدیک اس لفظ کا اطلاق ہر صاحب عزت وعظمت پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ انجیل میں ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام نے یہود سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "تمہاری شریعت میں لکھا کہ میں نے کہا کہ تم خدا ہو"۔

(یوحنا باب 10 آیت 25)

زبور میں ایسے الفاظ موجود ہیں۔

"میں نے کہا تھا کہ تم الہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو"۔ (تورات کی اس آیت میں قاضیوں پر الہ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ مسیحی مفسر ولیم میکڈونلڈ کے الفاظ میں "ان قاضیوں کو الہ کہا گیا اس لئے کہ جب وہ لوگوں کا انصاف کرتے تھے تو خدا کی نمائندگی کرتے تھے۔ الہ کے لئے عبرانی لفظ "الوہیم" کا لغوی مطلب ہے۔ سورما' زور آور ہستیاں اور اس کا اطلاق اہم افراد مثلاً" قاضیوں پر صحیح ہے" 'تفسیر الکتاب ص ۳۷۵'۔ مترجم)

(زبور باب 82 آیت 6)

تورات میں موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لئے گویا خدا ٹھہرایا۔ اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا"۔

(خروج باب 7 آیت نمبر1)

الہ کا اطلاق ہر اس ذات پر بھی ہوتا ہے۔ جس کی عبادت کی جائے خواہ وہ ذات قابل عبادت ہو یا نہ ہو۔ ایسے تنگ رستوں پر چلنے والے شخص کو جب آزادی مل جاتی ہے۔ تو پھر وہ اس پر مداوت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس میں بے سوچے سمجھے گھس جاتا ہے۔

مذکورہ تمام تفصیل کو پولوس نے اپنے دوسرے خط کی نویں فصل میں اس قدر واضح کیا ہے۔ کہ شک و ارتیاب کے تمام بادل چھٹ جاتے ہیں۔ ہاں جس شخص کو عقل اور علم کی دولت نصیب نہ ہوئی اس کے لئے یہ صراحت بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔

"اور سوا ایک کے اور کوئی خدا نہیں۔ اگرچہ آسمانوں اور زمین میں اور بہت سے خدا کہلاتے ہیں۔ چنانچہ بہتیرے خدا اور خداوند ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک تو ایک ہی خدا ہے۔ یعنی باپ جس کی طرف سے سب چیزیں ہیں۔ اور ہم اسی کے لئے ہیں۔ اور ایک ہی خداوند ہے یعنی یسوع مسیح جس کے وسیلہ سے سب چیزیں موجود ہوئیں۔ اور ہم بھی اسی کے وسیلہ سے ہیں" (امام صاحب نے جس کتاب سے یہ عبارت نقل کی ہے اس کا معنی قدرے مختلف ہے "اور ایک ہی خداوند ہے یعنی یسوع مسیح جس کے ہاتھ میں سب کچھ اور ہم بھی اسی کے قبضہ میں ہیں" : مترجم)

س (1 کرنتھیوں باب 8 آیت نمبر 4 تا 6)

کیسی پیاری گفتگو ہے۔ تصریح کر دی کہ الہ اور رب کا اطلاق اللہ عزوجل پر بھی ہوتا ہے۔ اور غیر اللہ پر بھی جو عبادت کے قابل نہیں ہوتا۔ پھر عبادت کے لائق الہ کی صفات بیان کیں۔ کہ جس کی طرف

ے سب چیزیں ہیں۔ (خالق) پھر تصریح کی وہ ذات جس نے ہر چیز کو وجود بخشا وہ اللہ ہے۔ جو وحدانیت کی صفت سے متصف ہے۔ "اور سوا ایک کے اور کوئی خدا نہیں" کہہ کر غیر کے معبود ہونے کی نفی کر دی۔ پھر مسیح علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا۔ اور ان پر خدا کا اطلاق کیا جس کا ایک معنی مالک بھی ہے۔ اس سے اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام میں الٰہی صفات نہیں پائی جاتیں بلکہ آپ مالک ہیں اور صفت ملکیت تو کسی بھی شخص کے لئے ثابت کی جا سکتی ہے۔

عقیدہ تجسیم و کفارہ

دیکھئے کس قدر خوبصورت اشارات ہیں۔ عقل سلیم کا مالک شخص انہیں تسلیم کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ کس قدر تعب خیز بات ہے۔ کہ اس مذہب کے پیرو نے اس مذہب کی بنیاد کھلی گمراہی پر رکھی ہے۔ جہالت کی وجہ سے ان لوگوں نے انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے بارے میں بے باکانہ ایسی بے ہودہ گفتگو کی جرات کی۔ چونکہ یہ لوگ ان مفروضوں کو نسل در نسل منتقل کرتے آئے ہیں۔ اس لئے ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اولاد آدم سے آدم علیہ السلام کی خطا کی وجہ سے مواخذہ کیا گیا ہے۔ اور اسی خطا کی وجہ سے انبیاء اور اولیاء جہنم کے مستحق ٹھہرے۔ پھر اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا۔ کہ وہ اگر قربانی دیں تو انہیں جنت ملے گی۔ تو ایک کریم ذات کی قربانی عمل میں آئی۔ کیونکہ جب قربانی کی ضرورت پڑی تو کریم اپنی ذات کو قربان کر دیتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسی ذات ہے جو مجرد ہے۔ نہ تو اسے تکلیف دی جا سکتی ہے۔ اور نہ ہی اس پر ظلم کیا جا سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس قربانی کی خاطر ناسوت عیسیٰ سے متحد ہوا۔ پھر اس

متحد بہ ذات کو سولی دی گئی۔ اس طرح یہ قربانی انبیاء اور اولیاء کی نجات کا سبب بنی۔ اور اللہ نے انہیں جہنم سے بچا لیا۔ (اللہ تعالیٰ ایسی بے ہودہ گفتگو سے محفوظ رکھے)

باپ اور بیٹے کا صحیح مفہوم

باپ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر اور بیٹے کا اطلاق اپنی ذات پر یہ ایک مقصد کے تحت ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں۔ (عیسائی عقیدہ کے مطابق مسیح علیہ السلام مخلوق نہیں مولود ہیں۔ وہ ازلی ابدی تمام صفات الوہیت سے ازل سے متصف ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز باپ سے کسی طرح مرتبہ اور حیثیت میں کم نہیں کیونکہ باپ اور بیٹا ایک ہی جوہر سے دو الگ الگ اقنوم (شخصیتیں) ہیں۔ لفظ باپ اور بیٹے کا اطلاق تو اقنوم کی نشاندہی کے لئے ہے۔ : مترجم) کہ کوئی ایسی خصوصیت پیدا ہو جائے جو اللہ اور عیسیٰ علیہ السلام میں امتیاز پیدا کر سکے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق تورات (جسے یہ لوگ کلام الٰہی یقین کرتے ہیں) میں یہ نص موجود ہے۔

"اور تو فرعون سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا ہے بلکہ میرا پہلوٹھا ہے اور میں تجھے کہہ چکا ہوں کہ میرے بیٹے کو جانے دے تاکہ وہ میری عبادت کرے اور تو نے اب تک اسے جانے دینے سے انکار کیا ہے سو دیکھ میں تیرے بیٹے کو بلکہ تیرے پہلوٹھے کو مار ڈالوں گا۔"

(خروج باب ۶ آیت نمبر ۲۲ ۲۳)

میرے بیٹے سے مراد بنی اسرائیل ہیں جن کی تعداد اس وقت

بچوں اور عورتوں کے علاوہ سات لاکھ تھی۔

یہ الفاظ تورات کے تھے زبور کے الفاظ یوں ہیں۔

"اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو"

(باب ۸۲ آیت ۶)

عیسیٰ علیہ السلام نے بیٹے کا اطلاق اپنی ذات پر بھی کیا اور پیروکاروں پر بھی۔

"میں اپنے باپ اور تمہارے باپ اور تمہارے خدا اور اپنے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں" ۔

(یوحنا باب ۲۰ آیت نمبر۱۷)

اس نص سے واضح ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں آپ کو خدا ماننا کھلی گمراہی ہے۔

انجیل لوقا میں ہے۔

"تم کسی کی امید کو منقطع نہ کرو۔ تمہیں اجر کثیر دیا جائے گا۔ تم خدا کے بیٹے ہو تو وہ کس قدر گناہ گاروں پر بھی رحیم ہے۔ تم اپنے باپ کی مثل رحیم بن جاؤ۔"

عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد یوحنا بن زبدا نے بھی اس لفظ کا مجازاً" اطلاق کیا ہے۔ عنقریب جسے ہم بیان کریں گے۔ اپنے ایک خط میں کہتا ہے۔

"جس کا یہ ایمان ہے کہ یسوع ہی مسیح ہے۔ وہ خدا سے پیدا ہوا ہے" (ایوحنا ۵:۱)

جب کسی لفظ کا حقیقی معنی قطعی طور پر صحیح نہ ہو تو مجازی معنی مراد لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس نص میں "وہ خدا سے پیدا ہوا ہے۔"

کا مجازی معنی مراد لینا ضروری ہے۔ کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے بہت زیادہ پیار ہوتا ہے۔ اور وہ اس سلسلہ میں رافت، رحمت اور شفقت کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ شدت سے چاہتا ہے کہ انہیں ہر قسم کی بھلائی پہنچے اور ہر تکلیف سے محفوظ رہیں۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ وہ نیکی کی راہ اختیار کریں۔ اسی لئے وہ نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ اور ہر اس چیز سے روکتا ہے۔ جو عقوبت ملامت دائمی نقصان یا جہالت کا سبب بنے۔ جس سے کہ بچوں کا مستقبل تاریک ہونے کا خدشہ ہو باپ اپنی اولاد سے یہی سلوک کرتا ہے اور یہی ہمارا روز کا مشاہدہ ہے۔

اسی طرح بیٹا اپنے باپ کی فرمانبرداری کرتا ہے اس کی تعظیم و تکریم بجالاتا ہے اس سے حیاء کرتا ہے۔ اس کا حکم مانتا ہے اور اس سے عزت و احترام سے پیش آتا ہے۔ بچہ اپنے باپ سے اختلاف کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ اور اس کے امر اور نہی کو غور سے سنتا ہے۔

اب دیکھئے اللہ تعالیٰ کے ہر نبی پر کس قدر احسانات ہیں۔ وہ اپنے بندوں سے کس قدر رحمت اور شفقت برتتا ہے۔ وہ بھلائیوں کی بارش فرماتا ہے۔ اور تکلیفوں سے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔ اللہ کا اپنے بندوں سے ایک خاص تعلق ہے۔ اسی لئے وہ انہیں عمل کی توفیق دیتا ہے۔ جو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ انسان سے وہی سلوک کرتا ہے۔ جو والد اپنے بچوں سے کرتا ہے۔

پھر انبیاء بھی اللہ تعالیٰ کی توقیر کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہیں۔ اس کے احکام کو مانتے ہیں۔ اور نواہی سے اجتناب کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تکریم اس قدر کرتے ہیں۔ جتنی بچہ والدین کی بھی بجا نہیں لا سکتا۔ وہ ذات بھی والدین سے کہیں زیادہ رحیم ہے۔ اور

انبیاء بچوں کی نسبت کہیں زیادہ فرمانبردار ہیں۔

مذکورہ نصوص کی مانند تمام نصوص کو مجاز پر محمول کرنے کی اصل وجہ یہی تعلق ہے۔ باپ کا مجازاً" اطلاق اللہ پر کیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انبیاء پر بہت رحیم ہے۔ اور وہ لطف و کرم کی انتہا فرماتا ہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام پر بیٹے کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی تکریم بجالاتے ہیں۔ امید منقطع نہ کرنے کی تلقین کا مفہوم یہی ہے۔

"وہ خدا سے پیدا ہوا ہے۔"

انبیاء نے اس راز کو سمجھا اور پھر انہیں اس اطلاق کی اجازت دی گئی۔ کیونکہ اعتماد تھا۔ یہ لوگ عقل و خرد کے ساتھ ساتھ علوم کے بھی حامل تھے۔ اس لئے اس اطلاق کے باوجود خیالات فاسدہ سے بچ سکتے تھے۔

عیسائی آج بھی باپ اور بیٹے کا مجازی اطلاق کرتے ہیں۔ جب وہ کسی راہب یا پوپ کو دیکھتے ہیں۔ تو اسے "اے باپ" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ حقیقت میں ان کا باپ نہیں ہوتا بلکہ باپ کہنے کی وجہ وہی ہے۔ جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔ یہ لوگ ان راہبوں کو شفقت کی وجہ سے باپ کہتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو توقیر کی وجہ سے بیٹا کہتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور میں اسی حقیقت کو عیاں کیا ہے آپ فرماتے ہیں۔

"جیسے باپ اپنے بیٹوں پر ترس کھاتا ہے۔ ویسے ہی خداوند ان پر جو اس سے ڈرتے ہیں ترس کھاتا ہے"۔

(زبور باب ۱۰۳ آیت ۱۳)

ہماری اس گفتگو سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام پر بیٹے کا اطلاق ان میں سے کوئی ایسی خصوصیت پیدا نہیں کرتا جو آپ کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی ہو۔ اوز حقیقی بیٹا بنا دیتی ہو۔

اس تاویل پر انجیل کی شہادت یوں ہے۔

"اس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا" ۔

(یوحنا باب ۱ آیت ۱۲)

یعنی اس نے انہیں وہ مقام بخشا جو بیٹے کو باپ کے حضور حاصل ہوتا ہے۔ یعنی باپ بیٹے سے بہت زیادہ شفقت فرماتا ہے۔ اس کی خیر خواہی کرتا ہے اور اسے نقصان سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

خاتمہ

الوہیت مسیح کے ثبوت میں اہم ترین دلیل - عیسائی دنیا جس کا سہارا لیتی ہے یوحنا کی یہ ابتدائی آیت ہے۔

"ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا "۔ (یوحنا باب نمبر ا آیت نمبر ا)

سب چیزیں اسی کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی...... اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا۔

(یوحنا باب ا آیت ۱۴)

فصل کی ان ابتدائی آیات کا الوہیت مسیح کے ثبوت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے

باقی اقانیم اس کی مختلف حیثیتیں ہیں۔

ا:۔ اگر اللہ تعالیٰ کو اس کی حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ کسی ایسی صفت سے متصف ہے جس صفت کا پایا جانا اس سے پہلے کسی اور صفت کے پائے جانے پر موقوف نہیں ہے تو اس حیثیت کو باپ کا اقنوم کہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا باقی صفات سے مقدم ہونا ضروری ہے۔

۲:۔ اگر اللہ تعالیٰ کو اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ کسی ایسی صفت سے متصف ہے جس سے پہلے کسی ایسی صفت کا پایا جانا ضروری ہے۔ جو اس سے مقدم ہو تو اسے بیٹا اور کلام کا اقنوم کہیں گے۔ جیسا کہ ذات کا عالم ہونا ذات کے پائے جانے پر موقوف ہے۔

۳۔ اگر اس ذات کا اعتبار کیا جائے اس قید کے ساتھ کہ اس ذات کا ہونا اس کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے تو اس کو روح القدس کہتے ہیں۔

پس باپ سے مراد ذات واجب الوجود ہے۔ کلام اور بیٹے سے مراد عالم ہے۔ اور روح القدس سے مراد اللہ تعالیٰ کی عقلی حیثیت ہے۔ اس اصلاح کا ماحاصل یہی مفہوم ٹھہرتا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے۔ کہ ذات باری تعالیٰ وضع میں یکتا ہے۔ اور ان اقانیم میں سے ہر ایک اقنوم سے متصف ہے۔

کچھ لوگوں کا نظریہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا اعتبار من حیث الذات کیا جائے اور صفت کا اعتبار نہ ہو۔ ایسی صورت میں ذات باری تعالیٰ صرف عقل سے عبارت ہو گی۔ اور اسی کو باپ کا اقنوم کہیں گے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کا اعتبار اس حیثیت سے کیا جائے کہ وہ ذات عالم ہے۔ تو

ذات باری تعالٰی عاقل ٹھہرے گی۔ اور اسے بیٹے اور کلام کا اقنوم کہا جائے گا۔ اور اگر اللہ تعالٰی کو اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ ذات محض عقلی ہے تو ان کے نزدیک یہ روح القدس کا اقنوم ہو گا۔

اس اصلاح کی بناء پر عقل سے مراد صرف اور صرف اللہ تعالٰی کی ذات ہو گی اور باپ اس کے ہم معنی ہو گا عاقل بھی اس کی ذات قرار پائے گی۔ مگر اس قید کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ کہ وہ اپنی ذات سے واقف ہے اور بیٹا یا کلام اس کے مترادف ہو گا معقولیت سے مراد باری تعالٰی کی ذات ہو گی مگر اس حیثیت سے کہ وہ سمجھی نہیں جا سکتی محض عقلی ہے۔ اور روح القدس اس کے مترادف ہو گا۔

ان دو اصطلاحوں سے ثابت ہوا کہ کلام سے مراد ایسی ذات ہے جو علم اور عقل سے متصف ہے کلام کا مفہوم بھی یہی ہو گا۔ پھر ان دونوں میں سے ہر ایک اس ذات کا اقنوم ہو گا۔ جس کا مدلول عالم اور عاقل ہے۔

پس یوحنا کے اس قول "ابتدا میں کلام تھا" سے مراد یہ ہے کہ ابتدا میں عالم (جاننے والا) تھا اور "کلام خدا کے ساتھ تھا" سے مراد یہ ہے۔ کہ عالم کی صفت ازل سے اللہ کے لئے ثابت تھی اور آیت میں "تھا" سے مراد یہ ہے۔ کہ وہ ازل سے تھا "اور کلام خدا تھا" اس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ کلام جس کا مدلول عالم ہے۔ وہ ذات اللہ کی ذات ہے۔ "یہی ابتداء میں کلام تھا" کا معنی یہ ہے۔ کہ اللہ تعالٰی کی ذات ازل سے صفت علم سے متصف ہے۔ جو کہ کلام کا مدلول ہے۔ کیونکہ کلام سے خدا مراد لینا یوحنا کے قول سے بالکل واضح ہے جیسا کہ یوحنا کہتا ہے۔ "کلام خدا تھا" اور یہ جملہ اس وہم کو دور کرنے کی وجہ سے ذکر کیا گیا

ہے۔ کہ کلمے کا مدلول بعض مقامات پر الہ کے علاوہ کوئی اور بھی ہے۔

اس فصل میں دو اور شبہات بھی ہیں۔ جو گمراہی کا سبب بن سکتے ہیں۔

ا:۔ "ایک آدمی یوحنا نام آموجود ہوا جو خدا کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ یہ گواہی کے لئے آیا کہ نور کی گواہی دے۔ سب اس کے وسیلہ سے ایمان لائیں۔ یہ خود تو نور نہ تھا مگر نور کی گواہی دینے کو آیا تھا۔ حقیقی نور جو ہر آدمی کو روشن کرتا ہے۔ دنیا میں آنے کو تھا وہ دنیا میں تھا اور دنیا اس کے وسیلہ سے پیدا ہوئی اور دنیا نے اسے نہ پہچانا۔

(یوحنا باب ا آیت ٦ تا ١٠)

ان آیات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کلمات سے متصف شخصیت ازل سے دنیا میں ہے۔ اور دنیا اسی کے وسیلہ سے بنائی گئی ہے۔

یہ شخصیت یا تو ناسوت ہے۔ جو لاہوت سے بالکل جدا ہے۔ یا اس کا لاہوت سے تعلق ہے۔

یا یہ شخصیت اپنی اصل حیثیت میں لاہوت ہے۔

یا پھر ناسوت میں ظہور کئے ہوئے ہیں۔

یا یہ شخصیت حقیقت ثالثہ ہے۔

یہ تمام صورتیں باطل ہیں۔ صرف ایک صورت صحیح ہے۔ کہ وہ شخصیت لاہوت ہے اور اپنی اصلی حیثیت میں ہے۔

اس شخصیت کا ناسوت ہونا دونوں صورتوں میں باطل ہے۔ خواہ اس کا تعلق ناسوت سے جوڑیں یا اسے جدا تصور کریں۔ جدائی کی صورت میں تو ظاہر ہے اور تعلق کی صورت میں بھی کوئی اشکال سامنے

نہیں آتا۔ کیونکہ لاہوت کے ساتھ تعلق حادث ہے۔ اور یہ تعلق تخلیق کے بعد ہی مانا جا سکتا ہے۔ بعد میں تخلیق ہونے والا لازوال نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حقیت ثالث والی صورت بھی باطل ہے کیونکہ اس حقیقت کا ایک جزو ناسوت ہے۔ جو کہ حادث ہے۔

یقیناً۔ یہ جزو تخلیق سے قبل معدوم تھا لہٰذا کسی صورت میں بھی لازوال نہیں ہو سکتا اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔ کہ ان کلمات سے متصف شخصیت اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی اصل حیثیت میں ہے۔ جو نہ تو ناسوت میں ضم ہے اور نہ ناسوت اس میں۔ ایسی صورت میں پوری گفتگو کا رخ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف پھر جاتا ہے۔ گویا کہا جا رہا ہے "بلکہ وہ اس نور کی گواہی دینے کے لئے آیا جو سچائی کا نور ہے۔ جس سے ہر شخص پر سچائی آشکار ہوتی ہے۔ کیونکہ سچائی خداوند قدوس ہے۔ جو ہر شخص کو اپنی معرفت کے نور سے حقیقت کے راستے دکھاتا ہے۔ اور انسان کو اس روشنی کے ذریعے اپنی تخلیق کردہ اشیاء کی ان باریکیوں سے آگاہ فرماتا ہے۔ جن تک عقل صرف نور ہدایت کی مدد سے رسائی حاصل کر سکتی ہے۔

انجیل میں نور کا اطلاق ہدایت پر بھی کیا گیا ہے عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

"جب تک میں دنیا میں ہوں دنیا کا نور ہوں۔"

(یوحنا باب ۹ آیت ۵)

اسی کی تصریح یوحنا کی بائیسویں فصل میں بھی ملتی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں۔ "میں نور ہو کر دنیا میں آیا ہوں" (۱۲: ۴۶)

اس کی مزید تصریح پچسویں فصل میں ملتی ہے۔ جس سے ہماری اس تاویل کی تائید ہوتی ہے۔ کہ نور سے مراد ہدایت ہے۔

۲:۔ "اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا......"

(یوحنا باب ا آیت ۱۴)

قبطی متن

مجسم ہوا کا لفظ غور طلب ہے۔ قبطی زبان میں اس وضع کو ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جائے گا۔ کہ عیسائیوں نے کہاں غلطی کا ارتکاب کیا۔ وضع کے اقتضاء سے کیسے انحراف کیا اور کیسے لفظ کا ایک ایسا معنی لے لیا جو بداہتہ" عقل کے خلاف ہے اور وہ اس کا حقیقی مفہوم نہیں ہے۔

اس لفظ کی قبطی زبان میں بناوٹ یوں ہے۔

"وہ یساجی أفاز او صرکس" ان کلمات کا مفہوم یہ ہے۔ "اور کلام نے جسم بنایا۔ اس اعتبار سے کوئی اشکال باقی نہیں رہتا بلکہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا اصل مفہوم کچھ یوں ہے۔ "اور کلام اللہ ہے جس نے ایک جسم تخلیق فرمایا اور اس نے ہم میں حلول کیا اور ہم نے اس کی بزرگی کو دیکھا" ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک جسم تخلیق فرمایا وہ عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لائے۔ عیسیٰ ہی ہیں جو ظاہر ہوئے اور ان کا جلال دیکھا گیا (خدا کی تجسیم امر محال ہے) عیسائی کہتے ہیں۔ کہ "افار" کا لفظ مشترک ہے اس کا ایک معنی بنانا ہے اور دوسرا معنی ہو جانا ہے۔ مگر عیسائیوں کا یہ عذر مضحکہ خیز ہے کیونکہ ایک معمولی سے قرینے

سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ کہ یہاں اس لفظ مشترک کا صحیح معنی کیا ہے۔ اس لفظ کا معنی "ہو گیا" لینا قاعدہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ جب مشترک کے معانی میں تردد ہو تو قرائن کے ذریعے اس کا ایک معنی متعین کیا جاتا ہے' یہاں تخلیق کرنے کے معنی کو مراد لینا بہ بنانا واجب ہے کیونکہ "ہو جانا" عقل کے صراحتاً" خلاف ہے۔ اور یہی اصل قرینہ ہے جو اس کے تخلیق کرنے کے معنی کو واجب ٹھہراتا ہے۔ عیسائی ایسے قواعد و ضوابط کی پابندی نہیں کرتے۔ جن کی بناء پر ان کے عقیدے کو ٹھیس پہنچتی ہو اور یہ علمی خیانت کے مترادف ہے۔ (۲۷)

میں نہیں سمجھتا کہ اس قوم سے بڑھ کر کسی اور قوم نے حضور باری تعالیٰ میں اتنی جسارت کی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں سمجھے۔ اس قوم سے زیادہ ذلیل اور رسوا بھلا اور کوئی قوم ہو سکتی ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ قبر میں مدفون ہوئے یوں کہہ کر حقیقت میں وہ اپنی کم علمی کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس بناء پر اتوار کے دن روزہ رکھنا واجب ہے۔ کیونکہ اتوار کے دن ہی کائنات کا خالق مدفون ہوا۔ یہ تصریح اکابر عیسائیوں کی کتب میں ملتی ہے۔

ومن یضلل فلن یجد لہ ولیا مرشدا۔

اعتراض:۔

افار کو "ہو گیا" کے معنی پر محمول کرنے کے قرائن موجود ہیں۔ اگر معنی خلاف عقل ہوا۔ قواعد کی پاسداری تو ہو گی۔

جواب:۔

ہر راجح معنی جو عقل سلیم کے خلاف ہو وہ مردود ہے۔ اور

اس کا اعتبار صحیح نہیں بلکہ ایسے معنی کو راجح کہنا جہالت کی انتہا ہے۔ ایسا شخص علم سے بے بہرہ اور حقیقت سے ناواقف ہے۔

ہمارے لئے تو اتنا کہنا ہی کافی ہے۔ کہ عیسائیوں نے علمی خیانت سے کام لیتے ہوئے افار کے معنی میں تحریف کی ہے۔ ہم تسلیم بھی کر لیں کہ افار کا معنی ہو گیا ہے۔ بنادیا نہیں تو بات پھر بھی شک و شبہ سے بالاتر رہتی ہے۔ کیونکہ فصل کی ابتداء میں صراحتہ" کہ گیا ہے۔ "کلام خدا تھا" اب ذرا سوچئے یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ خدا مجسم ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ لفظ کلام عیسائیوں کے نزدیک اس ذات پر بولا جاتا ہے جو علم اور نطق سے متصف ہو۔ جیسا کہ فصل کی ابتداء میں گزر چکا ہے۔ ایسی صورت میں کلام کا اطلاق صرف خدا پر نہیں ہوتا کیونکہ یہ لفظ مشکل ہے۔ (یہ ایک اصلاحی لفظ ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ ایک ایسا لفظ جس کے کئی معنی لئے جا سکتے ہوں)

جب لفظ مشکل کے مفہوم میں تردد ہو تو اپنے افراد میں سے ہر فرد کے لئے حقیقی معنی کے اعتبار سے استعمال ہوتا ہے۔ کلام کا لفظ ذات باری تعالیٰ کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ لیکن اس قید کے ساتھ کہ وہ علم اور نطق سے متصف قطع نظر اس کے کہ وہ ذات جسمیت سے متصف ہے۔ یا نہیں۔ فصل کی ابتدا میں کلام کا حقیقی معنی ایسی ذات ہے جو عالم ہے۔ اور جسمیت سے پاک ہے اور وہ ذات "یقیناً" ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ فصل کے آخر میں کلام سے مراد وہ ذات ہے جو عالم اور ناطق ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جسم بھی رکھتی ہے۔ یہ ذات یقیناً" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات ہے۔

"کلام مجسم ہوا" اس فقرے کا معنی یہ ہو گا کہ کلام کا مدلول

ذات الہ ہے۔ جو عالم ہے اور جسم سے پاک ہے۔ اس ذات نے ایک رسول کو مبعوث فرمایا جو جسم سے متصف ہے۔ گویا کلام مجسم ہوا کا مدلول عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ اور یہ کلام حقیقی معنی بھی ہو گا کیونکہ کلام کا معنی عالم ہے۔

یہ ساری گفتگو تو اس وقت ہو سکتی ہے۔ جب وہ تسلیم کرلیں کہ کلام کا لفظ ایسی ذات کے لئے وضع کیا گیا ہے جس میں رب قدوس کی ذات کے علاوہ کوئی اور ذات بھی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ دعوی کریں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اس کا اطلاق مجازاً ہو گا کیونکہ اس لفظ کے مفہوم میں مشارکت ثابت ہے جو مجاز کی اہم وجہ قرار پاتی ہے۔

اس تاویل کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ تاویل کسی دوسرے معنی کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقی معنی متعذر ہونے کی وجہ سے مجازی معنی کو مراد بہ بنانا تاویل کہلاتا ہے۔

اعتراض:۔

یہ تاویل تب مقبول ہو گی جب کلام کا ایک حصہ دوسرے حصے سے متعلق ہو۔ خصوصاً اللہ تعالیٰ کا کلام۔

جواب:۔

عقل سلیم جب کسی لفظ کے ظاہری معنی کو محال قرار دے تو اس کی تاویل واجب ہو جاتی ہے۔ تاویل سے مراد یہ ہے کہ ظاہری معنی کو مراد لے کر مجازی معنی لیا جائے جس کی طرف قرائن اشارہ کر رہے ہوں چونکہ ظاہری معنی خلاف عقل ہوتا ہے اور تاویل کی گنجائش ہوتی

ہے۔اس لئے مجازی معنی نہ لینے کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔

اب ہم اس نص میں موجود کلمات کے عدم تباین کو بیان کرتے ہیں ہم واضح کرتے ہیں کہ ان کلمات کی تاویل کیوں کی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ امر مسلم ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو اپنے نور سے ہر آنے والی چیز کو روشنی عطا فرماتی ہے۔ اور ہر مخفی چیز کے خفاء کو دور کرتی ہے۔ اس آیت میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے۔ یوحنا کہتا ہے۔ "وہ اس نور کی گواہی دینے آیا جو نور حق ہے۔ وہ ہر انسان کو اسی نور سے روشنی عطا فرماتا ہے" ۔ وہ دنیا میں تھا۔ یہ الفاظ نور کی صفت بھی ہو سکتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی صفت بھی۔ کیونکہ رہنمائی ہر خفی کو عیاں کرنا اور شک کا ازالہ فرمانا ازل سے باری تعالیٰ کے لئے ثابت ہے۔ "دنیا اس کے وسیلہ سے پیدا ہوئی" یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہیں۔

اس فصل کی ابتداء میں یہی تصریح ملتی ہے۔ "سب چیزیں اسی کے وسیلہ سے پیدا ہوئی" اس تصریح کے بعد کوئی عذر نہیں رہتا کہ ان الفاظ کو عیسیٰ علیہ السلام پر محمول کریں۔ ابتدائے فصل میں حمد باری تعالیٰ کے یہ الفاظ پڑھئے "کوئی چیز بھی اس کے بغیر نہیں پیدا ہوئی" ایک اور مقام پر یوحنا کہتا ہے۔ "وہ اپنے گھر آیا" ۔

(یوحنا باب ۱ آیت نمبر۱۱)

یعنی اس کا نور جو ہدایت اور راہنمائی ہے۔ حق تعالیٰ کے گھر ظاہر ہوا۔ کیونکہ اس کے نور سے ہر شخص راہنمائی پاتا ہے۔ یہاں نور کی آمد سے مراد نور کا ظاہر ہونا ہے۔ یوحنا کہتا ہے "اور اس کے اپنوں نے اسے قبول نہ کیا" ۔

(یوحنا باب ۱ آیت نمبر۱۱)

یعنی لوگوں نے ان کی ہدایت کو قبول کیا وہ ان لوگوں کے علاوہ جو دوسرے لوگ ہیں۔ جنہوں نے قبول نہیں کیا۔ یہ گفتگو حقیقت میں اس بات کی تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کی وجہ سے وہ مقام رفیع عطا کیا جس کی بناء پر وہ اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ یہاں صراحتہً رب قدوس کے نام کو ذکر نہیں کیا گیا تاکہ عظمت و کبریائی دلوں میں گھر کر جائے۔ یوحنا کے کچھ اور الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ "جو اس کے نام پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ نہ خون سے نہ جسم کی خواہش سے نہ انسان کے ارادہ بلکہ خدا سے پیدا ہوئے"۔

(یوحنا باب ا آیت نمبر ۱۲۔ ۱۳)

اس آیت کا مفہوم یہ ہے۔ کہ بیٹا ہونا جس کا شرف انہیں حاصل ہے۔ ایسا بیٹا ہونا نہیں جس کا تعلق مرد اور عورت کے ملاپ سے ہو یا جو خون اور گوشت سے بنا ہو بلکہ یہاں بیٹا ہونے کا مفہوم یہ ہے۔ کہ انہیں بارگاہ الٰہی میں کمال قرب حاصل ہے۔ فصل کی ابتداء آیات پر عطف کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ کہ کلام جس کا معنی عالم ہے۔ اس کا اطلاق کسی بھی عالم پر ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ جسم رکھتا ہو جیسے ذات رسول (عیسیٰ علیہ السلام) یا جسم سے پاک ہو جیسے ذات باری تعالیٰ۔

اقانیم ثلاثہ کے سلسلے میں ایک اور نظریہ بھی اپنایا گیا ہے جس کی بناء پر یا تو ایسے تین خداوں کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ جو ذات اور حقائق کے اعتبار سے ذہن اور خارج میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یا پھر اس نظریئے کی بناء پر سرے سے اللہ تعالیٰ کے وجود کی نفی ہو جاتی ہے۔

وہ نظریہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو باپ کی قید سے مقید ہے۔ بیٹا وہ ذات ہے جو بیٹا ہونے کی قید سے مقید ہے۔ اور روح

القدس ایسی ذات کا نام ہے جو طاقت گویائی سے مقید ہے۔ پھر اس کے باوجود خدا ایک ہے۔

دوران بحث جب ان کا گھیرا تنگ ہو جاتا ہے۔ اور انہیں کہا جاتا ہے کہ باپ کی ذات باپ ہونے کی صفت کے لئے مختص ہے۔ اور یہ ذات بیٹا ہونے کی صفت کو کسی صورت میں قبول نہیں کرتی اور یہی صورت حال بیٹے اور روح القدس کی ہے۔ پھر یہ ذوات ایک دوسرے سے مختلف بھی نہیں ہیں تو وہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ باپ کا علیحدہ شخصیت ہونا فرضی ہے۔ اور اسی طرح بیٹا کی الگ شخصیت بھی فرض کر لی جاتی ہے۔ ورنہ ذات تو ایک ہی ہے مگر مختلف صفات سے ان کا متصف ہونا ممکن ہے۔ ہاں یہ ہے کہ جب انہیں کسی ایک صفت سے متصف کرتے ہیں۔ تو دوسری صفت کی نفی کر دیتے ہیں۔ جو اس کی مخالف ہو۔ یہ جہالت اور غفلت کی انتہا ہے۔ کیونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ تینوں قدیم ہیں۔ ازلی ہیں۔ اور ان کی صفات بھی قدیم اور ازلی ہیں۔ تو گویا یہ تینوں اور ان کی صفات لازم و ملزوم ہیں۔ لہٰذا جب ملزوم پایا جائے گا۔ تو لازم بھی پایا جائے گا۔ اور جب لازم معدوم ہو گا۔ تو ملزوم بھی معدوم ہو گا۔ تو یہاں جب ایک صفت کی نفی کریں گے۔ تو ذات کی نفی لازم آئے گی۔ قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ "تحقیق انہوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے۔

دوسرا شبہ:

چنانچہ اس نے دیکھا اور خوش ہوا۔ یہودیوں نے اس سے کہا تیری

عمر ابھی پچاس برس نہیں ہوئی۔ پھر کیا تو نے ابرھام کو دیکھا ہے۔ یسوع نے ان سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ پیشتر اس کے کہ ابراھام پیدا ہو میں ہوں۔ (ان الفاظ سے مسیحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ازلیت کو ثابت کرتے ہیں : مترجم) بلکہ ہم خدا کی وہ پوشیدہ حکمت بھید کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ جو خدا نے جہان کے شروع سے پیشتر ہمارے جلال کے واسطے مقرر کی تھی"۔

(ا یوحنا باب ۸ آیت نمبر ۵۶)

جواب:

یہ گفتگو مجاز پر محمول ہے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام نے نہ تو آپ کی ولادت کا دن دیکھا نہ ہی بعث اور نہ ہی وہ دن دیکھا جس دن آپ کو تیری حقیقت کا حصول ہوا۔ جیسا کہ عیسائی دنیا اعتقاد رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ تمام واقعات ابراہیم علیہ السلام کے بعد وقوع پذیر ہوئے درحقیقت ان آیات کا مفہوم یہ ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام چاہتے رہے ہیں۔ کہ وہ ہمیشہ اللہ کی فرمانبرداری کریں۔ اور لوگوں کی بھلائی کے لئے شریعت کے اصولوں کا اظہار فرماتے رہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ بتایا گیا۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے۔ اور دنیا کو ہدایت کی راہ پر چلائیں گے۔ اور ان کے ہاتھوں ان کی شریعت کا اقتضاء انسانی بھلائی کی صورت میں پورا ہوگا۔ تو آپ کو نہایت مسرت ہوئی۔ یہاں رؤیت سے مراد بصیرت ہے۔ یعنی علم کی آنکھ سے دیکھنا نہ کہ ظاہری آنکھوں سے۔

کرنتھیوں کے نام پولس کے ایک خط سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ پولس کہتا ہے:

"بلکہ ہم خدا کی پوشیدہ حکمت بھید کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ جو خدا نے جہاں کے شروع سے پیشتر ہمارے جلال کے واسطے مقرر کی تھی "۔

(۱ یوحنا باب ۲ آیت ۷)

عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری پطرس بن یونا جو شمعون الصفا کے نام سے معروف ہے۔ اس نے بھی اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ رسولوں کے اعمال تیسری فصل میں کہتے ہیں:

"اے اسرائیلیو یہ باتیں سنو کہ یسوع ناصری ایک شخص تھا جس کا خدا کی طرف سے ہونا تم پر ان معجزوں عجیب کاموں اور نشانوں سے ثابت ہوا۔ جو خدا نے اس کی معرفت تم میں دکھائے۔ چنانچہ تم آپ ہی جانتے ہو۔ جب وہ خدا کے مقررہ انتظام اور علم سابق کے موافق پکڑوایا گیا"۔

(اعمال باب ۲ آیت نمبر ۲۲ ۲۳)

عیسائیوں کے نزدیک یہ دونوں شخص بڑی عظمت کے حامل ہیں۔ یہ بھی آیت کی وہی تاویل کر رہے ہیں۔ جو تاویل ہم نے کی ہے۔ ابن یونا نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ کہ اس آیت کے مصداق ایک مرد ہیں۔ اور ان کے ہاتھ پر جن معجزوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ان سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کار فرما ہوتی ہے۔ یہ معجزات عیسیٰ علیہ السلام کے ذاتی فعل کا نتیجہ نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"یسوع ناصری ایک شخص تھا۔ جس کا خدا کی طرف سے ہونا تم پر ان معجزوں اور عجیب کاموں اور نشانوں سے ثابت ہوا" (انجیل یوحنا میں ہے کہ معجزات الوہیت مسیح کی نہیں بلکہ انسانیت مسیح اور رسالت مسیح

کی دلیل ہیں۔ یہی کام جو میں کرتا ہوں وہ میری گواہی دیتے ہیں کہ باپ نے مجھے بھیجا ہے" یوحنا ۵:۳۶) مترجم)۔

یہ الفاظ اس حقیقت کو بیان کر رہے ہیں۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک انسان تھے۔ اس تاویل کو کوئی شخص نہیں جھٹلا سکتا۔

انجیل کی آیات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی متابعت اور فرمانبرداری فرض ہے۔ کہیں عمومی لہجہ ہے۔ اور کہیں خصوصی

عمومی کی دلیل حواریوں کا یہ قول ہے:

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بندھے گا۔ اور جو کچھ تو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھلے گا" ۔

(متی باب ۱۶ آیت ۱۹)

خصوصی کی مثال۔

تو پتھر ہے اور میں اس پر پتھر پر اپنا کلیسا بناؤں گا۔ (متی ۱۶:۱۸)

عموم اور خصوص کی یہ دونوں مثالیں صراحتہً انجیل متی کی اس آیت میں یکجا دیکھی جا سکتی ہیں۔

"تو میری بھیڑیں چرا' تو میرے مینڈھے چرا' تو میرے اونٹ چرا"۔

(یوحنا باب ۲۱ آیت ۱۷)

اس تاویل کی صحت پر یہ الفاظ شاہد عدل ہیں۔ "میں ابراہیم سے پہلے ہوں" ۔

(یوحنا باب ۸)

یہاں پہلے ہونے کی نسبت ناسوت کی طرف نہیں کی جا سکتی خواہ

اسے لاہوت سے جدا تصور کریں یا متحد قرار دیں اور اسی حقیت ثالثہ کی طرف بھی اس کی نسبت محال ہے۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں حادث ہیں۔ جو ابراہیم کے دور میں موجود نہیں تھیں۔ یہاں "پہلے ہونے" سے مراد بعث عیسوی اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج کا علم ہے۔ "خوش ہونے" کا مفہوم بھی یہی ہو گا۔

اعتراض:۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے عیسیٰ اور دوسرے انبیاء علیھم السلام میں کیا فرق ہے؟ بلکہ دوسری مخلوق اور عیسیٰ میں کیا فرق ہے؟ اس میں عیسیٰ کی کوئی خصوصیت نظر نہیں آئی۔

جواب:۔

تو جواب یہ دیں گے۔ کہ آیت کریمہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کو ذکر کرنا مقصود نہیں بلکہ یہود کے اس نظریئے کا رد ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام ولادت عیسوی اور آپ کی صداقت پر خوش نہیں تھے۔ درحقیقت یہ انبیاء کی تکذیب ہے۔ آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو بیان کیا گیا ہے۔ اریہود کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا دعویٰ نبوت فی الواقع حق ہے جو ازل سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس تاویل کی صحت کی دلیل یہ بھی ہے۔ کہ عیسیٰ نے یہ الفاظ اس وقت کہے جب یہودیوں نے آپ کے مذکورہ فرمان کو بعید از قیاس سمجھتے ہوئے یہ کہا کہ آپ کو تو پچاس سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ تو آپ نے جواباً مذکورہ الفاظ کہے۔ یہ آیت انبیاء و رسل کی نبوت کے قائل تو ہیں۔ مگر علم الیقین کی منزل تک نہیں پہنچے ان کے عقیدہ کی تقویت کا باعث بن سکتی ہے۔ رسول

کریم کی حدیث میں بھی ایسی مثال موجود ہے آپ نے فرمایا کنت نبیا و ادم بین الماء والطین ○ "میں اس وقت سے نبی ہوں جب آدم علیہ السلام پانی اور مٹی کی صورت میں تھے"۔ یہ کہنا بھی جائز ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ نے اس آیت کو اپنی خصوصیات کے لئے ذکر کیا ہو اور وہ خصوصیات یہ ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ علم دیا گیا۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام جلیل القدر نبی ہوں گے۔ جن سے بہت سارے لوگ ہدایت حاصل کریں گے۔ اور ان کے ہاتھوں ایسے معجزوں کا ظہور ہو گا۔ جو ان سے قبل کسی نبی سے ظاہر نہیں ہوئے۔ خصوصیات کی صورت میں بھی اس آیت سے الوہیت عیسیٰ ثابت نہیں ہو سکتی۔

تیسرا شبہ:

فارقلیط کی فصول کی پہلی فصل میں ابن زبدی نے لکھا ہے۔ کہ "فلپس نے اسے کہا اے خداوند! باپ کو ہمیں دکھا یہی کافی ہے۔ یسوع نے اسے کہا اے فلپس! میں اتنی مدت تمہارے ساتھ ہوں کیا تو مجھے نہیں جانتا۔ جس نے مجھے دیکھا ہے اس نے باپ کو دیکھا تو کیونکر کہتا ہے باپ کو ہمیں دکھا کیا تو یقین نہیں کرتا میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے۔ یہ باتیں جو میں تم سے کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا لیکن باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے۔ میرا یقین کرو کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں۔ نہیں تو میرے کاموں ہی کے سبب سے میرا یقین کرو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان رکھتا ہی۔ ہر کام جو میں کرتا ہوں وہ بھی کرے گا۔ بلکہ ان سے بھی بڑے کام کرے گا۔ کیونکہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں"۔

(یوحنا باب ۱۴ آیت ۸ تا ۱۲)

یہ نص انہی نصوص کی طرح ہے۔ جس کے اطلاق کا یہودیوں نے انکار کیا۔ اور عیسیٰ نے مثال دے کر حقیقت سے آگاہ کیا اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

جس نے مجھ کو دیکھا اس نے باپ کو دیکھا

اس نص کے کچھ الفاظ قابل وضاحت ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بھی جب کوئی ایسی بات کی جس میں خفا تھا۔ تو آپ نے اس خفا کو اپنے الفاظ میں یقینی طور پر دور کیا یہاں بھی یہی صورتحال ہے۔ کہ عیسیٰ سے جب یہ مطالبہ کیا گیا۔ کہ وہ یہودیوں کو خدا تعالیٰ کی زیارت کرائیں۔ چونکہ یہ سوال ایسا تھا جس کا پورا کرنا ناممکن تھا۔ تو عیسیٰ علیہ السلام نے اس سوال سے اعراض کرتے ہوئے فرمایا' جس نے مجھ کو دیکھا اس نے باپ کو دیکھا۔ یعنی جب رویئت باری تعالیٰ بندوں کے لئے ممکن نہیں تو اس نے اپنے احکامات کی تبلیغ کے لئے اپنے انبیاء کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا۔ جیسا کہ بادشاہ اپنے نائب مقرر کرتے ہیں۔ تو یہ انبیاء اوامر خداوندی سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ نواہی سے اجتناب کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے فرمودات کے مطابق ان میں فیصلہ کرتے ہیں۔ آپ نے تصریح کر دی کہ لفظ کا ظاہری معنی مراد نہیں۔ اسی لئے فرمایا یہ باتیں جو میں تم سے کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا' "لیکن باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے" یعنی میں جو گفتگو کرتا ہوں وہ الفاظ مفرد ہونے کی حیثیت سے تو کلام الٰہی نہیں ہیں' اور نہ ہی میرے افعال مگر اس ضمن جو احکامات میں تم تک پہنچاتا ہوں وہ اللہ کی طرف سے ہوتے

ہیں۔ یعنی میری ساری گفتگو من جانب اللہ ہوتی ہے۔ کیونکہ میں اس کی طرف سے خبر دیتا ہوں۔ اور میرے ہاتھوں معجزات کا صدور قدرت الٰہی کا کرشمہ ہے۔

پولس حواری کی تصریح جو پہلے گزر چکی ہے۔ اس تاویل کی تائید کرتی ہے۔

پولس کہتا ہے:

"کیونکہ خدا ایک ہے۔ خدا اور انسان کے بیچ میں درمیانی بھی ایک یعنی یسوع جو انسان ہے"۔

تصریح کے بعد پولس نے ایسے الفاظ ذکر کئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر ظاہری معنی لینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے آیت کو مجاز پر محمول کرتے ہوئے ترغیب دی کہ ایسے اسباب کو بروئے کار لایا جائے جن کی بناء پر انسان اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے کہ

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان رکھتا ہے یہ جو میں کرتا ہوں وہ بھی کرے گا۔ بلکہ ان سے بھی بڑے کام کرے گا"۔

(یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۲)

کیونکہ کسی بشر کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے افعال اللہ تعالیٰ کے افعال سے افضل ہیں۔ اسی لئے مجازی معنی کی پوری وضاحت نظر آتی ہے۔ مزید زور دیتے ہوئے کہا:

"کیونکہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں"

(یوحنا باب ۱۴' آیت ۱۲)

اگر عیسیٰ علیہ السلام حقیقت میں باپ ہوتے تو آپ یہ نہ فرماتے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں' کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی شخص

کے "میں زید کے پاس جاتا ہوں" حالانکہ وہ خود زید ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

"میرا یقین کرو کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں"

(یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۱)

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اردوں اور عیسیٰ علیہ السلام کے احکامات اور اردوں میں کوئی فرق نہیں۔ جیسا کہ مسئلہ حلول کی سطور میں اس مسئلہ کو بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ آیت اس حقیقت کو بھی عیاں کرتی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی کامل تابعداری کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کا فرمان ہے "یہ باتیں جو میں تم سے کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا"۔ اب ذرا غور کیجئے کس طرح صراحت ہے اور کس قدر قرائن موجود ہیں جو یہ بتا رہے ہیں کہ مسیح خدا نہیں۔ آپ کی صراحت کے بعد آپ کو خدا کیونکر مانا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس نص میں صراحت نہ بھی ہوتی مکمل اجمال ہوتا ہے۔ تو تب بھی خلاف عقل چیز کو عقیدہ بنانا صحیح نہ ہوتا۔ اور یہاں تو صراحت ہے پھر الوہیت عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا وَمَا لِنَتھدی لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ

اس نص کو ایک اور معنی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

انجیل متی میں اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ متی کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا' "کوئی بیٹے کو نہیں جانتا۔ سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے"۔

(متی باب ۱۱ آیت ۲۷)

آپ نے وضاحت فرما دی کہ مجھے میرے رب کے سوا کوئی نہیں

جانتا۔ آپ نے رویت باری تعالیٰ کی آرزو کرنے والے شخص کو بتا دیا کہ میں اتنا عرصہ تمہارے درمیان رہا اور تم میرے حقیقت سے آشنا نہیں ہوئے' حالانکہ میں انسان ہوں اور انسان کی معرفت ممکن ہے۔ تو اس کی معرفت کا تم کیسے تصور کر سکتے ہو۔ جسے آنکھ دیکھنے سے قاصر ہے اور اسے کسی "جنس یا فصل" کے حوالے سے بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر آپ نے ایک دوسری حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ معرفت الٰہی کے لئے ضروری ہے کہ طالب یہ یقین کرے کہ یہ احکامات اسی ذات کے احکامات ہیں' آپ نے فرمایا "یہ باتیں جو میں تم سے کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا" پھر اس پر اکتفاء نہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ بلکہ فرمایا "باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے" پھر اس نص میں اس حقیقت کو بیان کرتے چلے گئے۔ جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

لفظی شبہ

ایک لفظی شبہ ابھی باقی ہے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کلام کا اطلاق کیا جائے تو ضروری ہے کہ اس چیز کو مراد بہ بنایا جائے جو اقانیم کے سلسلے میں عیسائیوں کی اصلاح کے مطابق ہو تاکہ یہ کہنا صحیح ہو سکے کہ نص کا ظاہری معنی نہیں لیا جا سکتا۔ کیونکہ اس سے تین خداؤں کا ماننا لازم ٹھہرتا ہے۔

یہ خیال کرنا عظیم وہم اور اندھاپن ہے کہ اس کو کسی ایسے معنی پر محمول کیا جائے جو تمام شریعتوں کے نزدیک جائز ہو اسی لئے قرآن کریم کی اس آیت سے عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا استدلال کیا جاتا ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ

الاَّ الْحَقَّ ۝ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۝ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۝

"اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا۔ اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا۔ اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے۔ پس تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور نہ کہو کہ "تین" ہیں۔ باز آجاؤ یہ تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔"

میں چاہتا ہوں کہ اس شبہ کے متعلق کھول کر بیان کروں۔ تاکہ قرآن کریم کی اس نص کو دیکھنے والا اس گمراہ کن شبہ سے محفوظ رہ سکے۔

مسیح کو روح منہ کہنے کی وجہ

ہر مولود کی پیدائش کے دو سبب ہوتے ہیں' ان میں سے ایک سبب عورتوں میں پایا جاتا ہے' یہ سبب ایک تولیدی قوت ہے۔ عورت کا خون ایسی حالت اختیار کرلیتا ہے۔ کہ وہ قوت حیات کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

دوسرا سبب منی میں پائی جانے والی قوت ہے۔ یہ قوت رحم میں منتقل ہوتی ہے اور عورت کی منی سے مل جاتی ہے۔ بشرطیکہ منی قوی ہو۔ صحیح ہو' ٹپک کر نکلے اس میں کوئی کمی اور نقص نہ ہو۔ رحم صحیح ہو۔ کوئی بیماری لاحق نہ ہو۔ اور عورت جماع کے بعد کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے منی باہر نکل پڑے۔ ایسی صورت میں عورت کے خون میں یہ استعداد

ہوتی ہے۔ کہ وہ صورت عطا کرنے والے کی طرف سے عطا کی جانے والی صورت کو قبول کر سکے۔ اس سے انسانی اعضاء بنتے ہیں۔ جب منی اعضاء کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تو منی کی اپنی صورت باقی نہیں رہتی۔ پھر انسان کے اس ڈھانچے میں روح پھونکی جاتی ہے۔ ہر بچے کی پیدائش میں یہ سبب کارفرما ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے ثبوت کے بعد ہم کہیں گے کہ ہر چیز کے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک سبب قریب اور دوسرا سبب بعید۔

ہر چیز کو اکثر سبب قریب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ انسان جب سرسبز و شاداب باغ دیکھتا ہے۔ تو پکار اٹھتا ہے۔ کہ بارش کی صنعت گری دیکھئے حالانکہ حقیقت میں یہ روپ دینے والا اللہ ہے۔ اگر کسی چٹان پر سبزہ لہرا رہا ہو یا شیر کے جسم پر قدرتی طور پر سورج بنا ہو۔ تو کہا جاتا ہے کہ اللہ کی صنعت گری دیکھئے۔ چونکہ سبب عادی نہیں پایا جا رہا ہوتا ہے اس لئے سبب حقیقی کی تصریح کر دی جاتی ہے۔

ان دو اصولوں کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں سبب قریب مفقود ہے۔ اس لئے ان کی پیدائش کو سبب بعید (حقیقی سبب) کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے۔ اور وہ سبب کلمہ کن ہے کیونکہ مخلوق کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے لفظ "کن" سے پیدا ہوا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صراحتہ" سبب قریب جو عادی سبب ہے اس کے انتفاع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کہا ہے۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام وہ ذات ہیں جو منی کے ملاپ کے بغیر محض کلمہ کن سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور ان کی پیدائش کو کلمہ کن کی طرف منسوب کرنا صحیح بھی ہے۔ جیسا کہ تفصیلا" بیان ہو چکا ہے

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ" کہ

یہ بچہ القائے منی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کی پیدائش کلمہ کن کے القاء سے ہوئی ہے۔ گویا آیت میں القا مجازی ہے۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش میں چونکہ دونوں عادی سبب معدوم ہیں۔ اس لئے فرمایا۔ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَى

ترجمہ:۔ "تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اسے سجدہ کرے جسے میں نے اپنے ہاتھ سے تخلیق کیا"

اللہ تعالیٰ ہاتھوں سے پاک ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے۔ کہ میں نے آدم کو اپنی قدرت کاملہ سے تخلیق کیا ہے۔ نہ تو یہ منی سے تولد ہوئے اور نہ ان کی پیدائش میں کوئی اور عادی سبب کار فرما ہے۔ عادی سبب نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی تخلیق کو سبب بعید کی طرف جو حقیقی سبب ہے منسوب کیا۔ اور وہ سبب "کلمہ کن" ہے۔ اسی مماثلت کو واضح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ ان مثل عیسیٰ عنداللہ کمثل ادم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون○

ترجمہ: "بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے ہاں آدم کی مثال جیسی ہے۔ اسے مٹی سے تخلیق کیا گیا پھر اسے کہا ہو جا تو وہ ہو گیا"۔

ایک اور مقام پر "وروح منہ" کے الفاظ آئے ہیں۔ جن کا مفہوم یہ ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک روح ہیں جس کی تکوین میں عادی سبب کار فرما نہیں اور منہ روح کی صفت ہے۔

اعتراض:۔

یہ دلیل اس کی اصل فرع ہے کہ کلمہ سبب ہے۔ اور کلمہ کی سببیت فرع ہے کہ وہ شرط اور جزا کے قاعدے کو قبول کرے آیت کریمہ

میں شرط اور جزا کی صورت ممتنع ہے۔ کیونکہ سبب اور مسبب میں مغایرت نہیں ہے۔ فارسی کہتے ہیں کہ اگر جواب شرط کی مذکورہ صورت صحیح ہوئی تو "اذھب فتذھب" کے قائم مقام "کن فیکون" ہوگا جو ممتنع ہے۔ کیونکہ اس طرح "کن فیکون" شرط اور جزا بن جائیں گے۔ اور اسے شرط و جزا بنانا صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ ان "تکن تکن" اور "ان تذھب تذھب" شرط اور جزا نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ان مثالوں میں سبب اور مسبب ایک ہی چیز ہے۔ اسی لئے تمام قرا یکون کی نون پر پیش پڑھتے ہیں۔ کسائی نے صرف انہی آیات میں ابن عامر کی پیروی کی ہے۔ جن میں نصب کا امکان تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ وہ بھی اسے جواب شرط مانتے ہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک عطف بھی ممکن ہے۔ اور یہ متابعت بھی صرف دو آیتوں میں ہے۔ پہلی آیت۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

اور دوسری آیت کریمہ ہے۔

"اِنَّمَا اَمْرُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنَاهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ"

فیکون کا جواب شرط بننا جب دونوں صورتوں (منصوب اور مرفوع) میں ممتنع ہے۔ تو اس آیت کو بطور دلیل نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اور کلمہ کا سبب بننا ممتنع ہو جاتا ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ یہ بحث و تمحیص بڑی دلچسپ ہے۔ اہل عرب کبھی تو معانی کا لحاظ کرتے ہوئے جواب شرط ذکر کرتے ہیں۔ اور کبھی معانی کا لحاظ رکھے بغیر صرف الفاظ کی صورت کا اعتبار کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کی آیت کریمہ "اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا" اس آیت کریمہ میں جواب شرط "فینظرو" معانی کا

لحاظ کے بغیر ظاہری الفاظ کو دیکھ کر ذکر کیا گیا ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے۔ کہ انہوں نے سفر کیا اور دیکھا.......

یہ آیت کریمہ محض ایک خبر پر مشتمل ہے' یہاں کسی قسم کا استفہام نہیں ہے' اگر یہ گمان کیا جائے کہ مذکورہ آیت میں فاعاطفہ ہے اور فینظروا کا نون یسیروا پر عطف کی وجہ سے حذف ہوا ہے۔ تو یہ بھی صحیح ہے۔ دوسرا احتمال ہونے کے باوجود صرف جواب استفہام کے احتمال کو مختص کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اس اشکال کو ایک اور آیت کریمہ کے ذریعے دور کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہ جاتا۔ وہ آیت کریمہ یہ ہے۔ افلم

یسروافی الارض فتکون لهم قلوب

ترجمہ: "کیا وہ زمین پر چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل میں بصیرت آجاتی"

جب یہ بات واضح ہو گئی تو اب یہ مسئلہ اس قاعدہ کی طرف پھر جاتا ہے۔ اس قاعدے کی رو سے (کن فیکون) میں جواب شرط معنیٰ کا اعتبار کئے بغیر صرف الفاظ کی ظاہری شکل کا لحاظ کر کے ذکر کیا گیا ہے۔

سیبویہ کہتے ہیں کہ عرف میں امر کے صیغہ پر معمول کا مرتب ہونا مشتبہ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ مقدور کا مرتب ہونا تاثیر قدرت کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ مثلاً" ایک آدمی اپنے غلام کو کھڑے ہونے کا حکم دیتا ہے۔ اور آقا کے ذہن میں یہ بات ہے کہ غلام کا کھڑا ہونا مسبب ہے۔ اور اس کا سبب صیغہ امر ہے۔ تو صیغہ امر گویا قیام کا سبب ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو قیام کا حقیقی سبب حکم دینے والے کا ارادہ ہے۔ جس پر صیغہ امر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً" آقا نے غلام کو کسی کام کے کرنے کا حکم دیا۔ اور غلام جانتا ہے۔ کہ آقا کا منشاء کچھ اور ہے۔ اب اگر غلام ظاہری الفاظ کی پیروی کرے تو

نافرمانی کا مرتکب ٹھہرے گا۔ اور ملامت کا سزاوار ہو گا۔ کیونکہ مامور کے دو سبب ہوتے ہیں ایک سبب قریب (حقیقی سبب) یعنی ارادہ اور دوسرا سبب بعید یعنی صیغہ امر۔ جو کہ عموماً ارادے پر دلالت کرتا ہے تو قاعدہ یہ بنتا ہے۔ کہ حکم سبب قریب پر موقوف ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عرف میں کلمہ کو مامور بہ شمار کیا جاتا ہے اور حکم اس پر موقوف ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد جو امر واقع ہوتا ہے۔ اسے اس سبب کا مسبب سمجھا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کے حقیقی اسباب اس سے بہت دور ہوں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے تو ایسی اشکال کے پائے جانے کا تعلق عربی ادب سے ہوتا ہے۔ جب عربی زبان کی ان اشکال کو قواعد کی رو سے بیان کیا جاتا ہے۔ تو اشکال یقینی طور پر ختم ہو جاتی ہیں۔ قواعد کو دیکھا جائے تو ابن عامر کے بارے میں یہ گمان زائل ہو جاتا ہے۔ کہ وہ "کُن فیکون" کی فاکو جزائیہ بناتے ہیں۔ کیونکہ یہ عربی اصول و قواعد کے خلاف ہے جیسا کہ یہ آیت کریمہ

اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ○

اس کے علاوہ اور کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں، جہاں صرف نصب پائی گئی ہے۔ اس لئے طرف تو قراء کی شکست آیت واضح کر دیتی ہے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ ○

کوئی وجہ نہیں کہ قراء کا نصب پر اجماع ہو جب کہ وہ فاکو جزائیہ مانتے ہوں۔ یقیناً ان کے نزدیک معنی کا لحاظ نہیں بلکہ صرف لفظ کی ظاہری شکل ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ بہر حال ابن عامر پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

اب دیکھئے ترکیب میں کس قدر حسن اور نکھار ہے، اس سے

شریعت محمدیہ کی عظمت عیاں ہوتی ہے۔ جس کی تائید افصح و اصدق نبی محترم ﷺ نے کی۔ یہ شریعت جب گویا ہوتی ہے تو کلام کے ہر حسن کو عیاں کرتی ہے۔ اور جب خاموش ہوتی ہے۔ تو کئی غرائب سامنے آتے ہیں۔ تعجب ہے اس گروہ پر جو اس قسم کی واضح نص سے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے تو بس اتنا کہنا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ نصوص کو الوہیت مسیح کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی ان آیات کی کوئی ایسی تعبیر کی جائے گی جو عقل کے صراحۃ" خلاف ہو اس کتاب کو لکھنے کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے ان لوگوں میں سے کرے جنہوں نے اس کے نور ہدایت سے سیدھی راہ اختیار کی اور قول و فعل میں اس کی توفیق اور عنایت سے خطا سے بچا لیے گئے۔ خلق خدا کے سردار محمد ﷺ۔ آپ کی آل اطہار اور صحابہ کرام پر درود سلام ہوں۔

انبیائے کرام کی آمد کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے انہیں اللہ رب العزت کی بارگاہ سے شخصیت کے ارفع اخلاقی کمالات کے ساتھ ساتھ تحیر خیز معجزات بھی عطا ہوئے۔ یہ معجزات وکمالات اس لئے تھے کہ ان کے خالق و مالک کی عظمت و کبریائی کی دلیل ٹھہریں، کہ وہ پروردگار کتنی قوتوں کا مالک ہے جس کے یہ صاحب کمال بندے ہیں۔ لیکن انسانی طبیعت کا یہ عجیب پہلو سامنے آیا کہ اس نے ان مقدس ومطہر شخصیتوں کے انہیں کمالات کو "حجاب" بنالیا جنہیں توحید ربانی کے عرفان کی سب سے محسوس ومبصر دلیل کے طور پر پیش کیا گیا۔ حضرت عیسی علیہ السلام تاریخ انسانی کی انہیں کرشماتی شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ آپ کی بھرپور اور مکمل شخصیت، آپ کی بے نیازی، عشق خداوندی آگاہ، غیر خدا کے بندوں سے آپ کی اتھاہ محبت اور خلوص اور پھر یہ کہ آپ سے صادر ہونے والی بے شمار معجز نمائیاں۔ انسانیت نے اتنی دل آویز شخصیت کے سحر میں گرفتار ہونا ہی تھا۔ لیکن انسانی طبیعت کی اسی عجیب بوقلمونی نے یہاں بھی اپنا رنگ دکھایا۔ اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں وہ غلو کیا گیا کہ حقیقت بے شمار حجابات میں پوشیدہ و پنہاں ہوگئی۔ یہ محبت کی کارفرمائی تھی یا آپ کی تعلیمات کے اثرات سے گھبرا اٹھنے والے کج فکر یہودیوں کی مکاری کا شاخسانہ، قرین قیاس یہ ہے کہ دونوں ہی عوامل کارفرما ہوئے۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیمات کا یہ اعجازی پہلو پوری انسانیت کے لئے مسیحا ثابت ہوا کہ اس نے توحید و رسالت کی تمام حقیقتوں کو بے غبار کر دیا اور انبیائے کرام کی پاکیزہ سیرتوں اور ارفع کمالات کو اس خوبصورت اور دلنشیں انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا کہ افراط و تفریط کے تمام زاویوں کو درست کر دیا۔ بے شمار سلیم الفطرت انسانوں نے اسلام کی اس وضاحت کو قبول کیا اور اسی عقیدہ صحیحہ کو اختیار کر لیا جو فطرت کے صاف اور سیدھے راستے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اس پیغام کے معارض بھی ٹھہرے اور اپنے قدیم عقیدے کی صحت پر مصر ہوئے اور اس کے جواز میں عقلی ونقلی دلائل لے کر سامنے آئے۔ امام غزالی ہماری روشن، درخشندہ اور قابل فخر علمی تاریخ کے نمایاں افراد میں سے ہیں۔ مروجہ علوم کا کونسا شعبہ ایسا ہوگا جس سے وہ واقف نہ ہوں بلکہ اس پر دسترس نہ رکھتے ہوں۔ زیر نظر رسالہ میں وہ اپنی بھرپور علمیت اور ناقابل رستگاری گرفت کے ساتھ نصاریٰ سے مکالمہ کر رہے ہیں۔ اس تحریر میں امام صاحب کا لب و لہجہ قدرے سخت ہے۔ کوچہ تصوف میں قدم رکھنے سے پہلے کی تحریروں میں جلال کی یہ کیفیت ان کے ہاں عام طور پر نظر آتی ہے۔ تصوف سے آشنا ہونے کے بعد وہ خود بھی مسیح علیہ السلام کی طرح سوز و گداز کے حامل نظر آتے ہیں۔ رسالے کا اسلوب ذرا مشکل ہے لیکن ہمارے فاضل دوست ظفر اقبال کلیار نے آسان، عام فہم اور رواں دواں ترجمہ کرنے سے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مقدمہ کتاب کے طور پر حضرت عیسی علیہ السلام کی مبارک شخصیت کے بارے میں ایک تفصیلی اور جامع تحریر بھی رقم کر دی ہے۔ اس تحریر سے بہت سے ایسے گوشے بھی آشکار ہوئے ہیں جو عام طور پر نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کاوش تسلیم حق کا ذریعہ ثابت ہو۔

(زاویہ نشین: محمد رضاء الدین صدیقی)

زاویہ

زاویہ